تدبّر
لاہور

جاری کردہ:

مولانا امین احسن اصلاحی

مدیر:

خالد مسعود

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث

لاہور۔ پاکستان

قرآن حکیم

- نفیس کتابت
- سلیس ترجمہ : مولانا امین احسن اصلاحیؒ
- حاشیہ : مشتمل بر اخذ و تلخیص از تفسیر تدبر قرآن: خالد مسعود
- سفید زمین اور نیلے حاشیہ کے ساتھ عمدہ طباعت
- خوبصورت جلد اور کور
- سائز 20x30/8 صفحات 1008 قیمت 550 روپے

ناشر: فاران فاؤنڈیشن 122 فیروز پور روڈ لاہور

تدبر حدیث

(جلد اول)

شرح موطا امام مالکؒ مولانا امین احسن اصلاحیؒ

(کتاب الزکوٰۃ، البیوع، الاقضیہ، الحدود، الاشربہ، العقول، الجامع، وغیرہ کے منتخب ابواب)

- ترتیب و تدوین : خالد مسعود، سعید احمد
- فہم حدیث کا ایک نیا انداز
- مالکی فقہ کی آراء کا محاکمہ
- خوبصورت طباعت و جلد بندی
- سائز 20x30/8 صفحات 544
- قیمت: 350 روپے

ناشر: ادارہ تدبر قرآن و حدیث، رحمان سٹریٹ مسلم روڈ سمن آباد لاہور

تدبّر

لاہور

جاری کردہ
مولانا امین احسن اصلاحی
مُدیر:
خالد مسعود

شمارہ 75
مارچ 2002ء
محرم 1423ھ

مجلس ادارت
عبداللہ غلام احمد (مدیر مسئول)
محبوب سُبحانی
سعید احمد
سید اسحاق علی

قیمت 12.50 روپے
سالانہ 50.00 روپے
بیرون ملک 250.00 روپے
(ماسوائے برصغیر)

فہرست

تذکرہ و تبصرہ
پاکستان میں اسلامی حکومت کا نعرہ — 2
عبداللہ غلام احمد

تدبر قرآن
مقدمہ تفسیر سورہ بقرہ — 10
حمید الدین فراہیؒ

تدبر حدیث
درس صحیح بخاری — 20
امین احسن اصلاحی/ سید اسحاق علی
درس موطا امام مالک — 31
امین احسن اصلاحی/ ماجد خاور

مقالات
رسول اللہ کی شخصیت پر اعتراضات — 39
خالد مسعود

مراسلہ و مذاکرہ
شکر نعمت: غیر یا شرکی صلاحیت — 51
امین احسن اصلاحی/ سید اسحاق علی

ناشر: ادارہ تدبر قرآن و حدیث رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور

عبداللہ غلام احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پاکستان میں اسلامی حکومت کا نعرہ

ہمارے ملک میں کئی نظامہائے حکومت کا تجربہ ہو چکا ہے۔ پارلیمانی جمہوریت، بنیادی جمہوریت، صدارتی حکومت، عسکری حکومت، اور اب ضلعی حکومتوں کا غلغلہ ہے۔ ان کے محرکات کیا تھے اور یہ حکومتیں کیونکر وجود میں آئیں اس پر بحث مطلوب نہیں البتہ اس میں شک نہیں کہ ان تجربات کے نتائج نہایت مضر ثابت ہوئے۔ ملک کے استحکام کو دھچکے لگتے رہے، وطن عزیز دولخت ہوا، مالی اور اقتصادی حالت دگرگوں ہوگئی، معاشرتی اور سماجی سطح پر ہم تلو بن کر رہ گئے۔ دفاعی لحاظ سے بھی صورت حال کچھ اچھی نہیں۔ ہماری ملکی اور نظریاتی سرحدوں پر دشمن ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ ہمارے اکثر سیاستدان بدستور پارلیمانی جمہوریت پر مصر ہیں۔ ان کا پختہ ایمان ہے کہ پارلیمانی جمہوریت ہی ملک کے دکھوں کا مداوا ہے۔ ایک طبقہ صدارتی نظام کو ہی اپنا سکہ جمانے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس کے باوجود ہر کسی کا نعرہ ہے کہ صرف ہم پاکستان کی اسلامی ریاست میں ایک اسلامی حکومت قائم کر سکتے ہیں۔

اسلامی ریاست کیا ہے اور کیا نہیں ہے، یہ بات وضاحت طلب ہے۔ دنیا میں ریاست کے لیے جو اصطلاحات رائج ہیں ان میں سے کوئی بھی اسلامی ریاست پر منطبق نہیں ہوتی۔ مناسب تو یہ تھا کہ اسلامی نظام کو دوسرے سیاسی نظاموں سے الگ ایک نظام کے طور پر پیش کیا جاتا مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ لوگوں نے اس کی تعریف کو مغربی سیاسی اصطلاحات کی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی جس سے اسلامی ریاست کا تصور دھندلا ہوا اور مزید الجھن پیدا ہوئی۔ کسی نے یہ کہا کہ اسلام میں حکومت کا مزاج جمہوریت کے قریب تر ہے تو اس نے اس کے لیے اسلامی جمہوریت کی اصطلاح اختراع کی۔ دوسرا اٹھا اور اس نے کہا کہ اسلام کا معاشی نظام سوشلزم کے زیادہ قریب ہے اس لیے اس نے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کو اختیار کیا۔ کچھ لوگوں نے اس کو 'الٰہی حکومت' (Theocracy) سمجھا اور اسے 'ملائیت' کا طعنہ دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام نہ جمہوری ہے نہ سوشلزم اور نہ پاپائیت، بلکہ ایک الگ نظام ہے جس میں معاشی، معاشرتی اور سیاسی رہنمائی بھی ہے اور دین اور سیاست دونوں بھی شامل ہیں جن میں سے ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اسلامی ریاست سے مراد ایک ایسا ادارہ ہے جس میں انسان کا منصب ایک خود مختار اور مطلق العنان ہستی کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے نائب اور خلیفہ کا ہے۔ اس کو ایک خاص

دائرہ کے اندر تصرف کا اختیار تو حاصل ہے لیکن یہ اختیار اس کا ذاتی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا تفویض کردہ ہے۔ زمین میں اصل حاکمیت اللہ کی ہے۔ اس میں قانون سازی اور تصرف کے جو اختیارات حاصل ہیں وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے تحت ہیں یا پھر ان دائروں کے اندر ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد چھوڑ دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ تنہا اس کائنات کا خالق و مالک اور حاکم ہے اس لیے اس کو حق پہنچتا ہے کہ اپنی مخلوق اور اپنے بندوں کے لیے نظام زندگی تجویز کرے اور ان کے لیے قانون بنائے۔ اس نے اس بات کو مبہم نہیں چھوڑا کہ زمین کے انتظام کے سلسلہ میں وہ کس چیز کو پسند کرتا ہے اور کس چیز کو پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ اس نے اپنے بندوں کو زندگی گزارنے کا طریقہ بتانے کے لیے ایک دین عطا فرمایا جس کا نام اس نے اسلام رکھا: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران: ۱۹) یہی دین اللہ کا دین ہے۔ یہ دین عدل وقسط کی میزان ہے۔ یہی دین اس کائنات کے نظام تکوینی میں نافذ ہے۔ اسی دین پر فطرت انسانی کی تخلیق ہوئی ہے۔ یہی دین اس نے ابتدا سے تمام نبیوں اور رسولوں پر اتارا۔ اس سے الگ اس نے کسی کو کوئی اور دین نہیں دیا۔ اللہ کے دین یعنی اسلام کے اصولوں پر جو ریاست قائم ہوتی ہے وہی اسلامی ریاست ہوتی ہے۔ اسی ریاست کا نام 'خلافت' ہے۔ جو حکومت یا گورنمنٹ خلافت کے ارادوں کی تنفیذ کرتی اور اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتی ہے 'امارت' اور 'امامت' کہلاتی ہے اور اس کے سربراہ کار کے لیے 'امیر' یا 'امام' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ربوبیت کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے پسندیدہ دین سے آگاہی اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے رہنمائی فرمائے چنانچہ اس نے انبیاء و رسل مبعوث فرمائے، اپنی کتابیں اور اپنی شریعت نازل فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے لیے اللہ کی توحید کے ساتھ ساتھ حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا اقرار ضروری ٹھہرا۔ اگر کوئی شخص رسول اللہ کی رسالت کا اقرار نہ کرے تو اس کا حاکمیت الٰہیہ کا اقرار بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ توحید کے ساتھ رسالت پر ایمان درحقیقت توحید ہی کا لازمی تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس کائنات کے خالق و مالک ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں اگر اس کی دنیا اور اس کی رعایا پر قانون کسی اور کا چلے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی عملی شکل درحقیقت رسول کی اطاعت ہی ہے اس لیے رسول ہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے نائب کی حیثیت سے اس کے احکام وقوانین سے باخبر کرتا اور ان کی تنفیذ کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی اطیعوا اللہ آیا ہے ساتھ ہی اطیعوا الرسول کا بھی حکم ہے۔ اس لیے اللہ اور رسول کی اطاعت کے درمیان فرق کرنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی

اطاعت کو تسلیم کرتے ہیں اور رسول کی اطاعت تسلیم نہیں کرتے ان کی مثال ایسی ہے کہ وہ کسی حکمران کی اطاعت تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے مقرر کیے ہوئے نائب کی اطاعت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ظاہر ہے اس قسم کی خودمختاری کی گنجائش نہ تو دنیا کے کسی قانون میں تسلیم کی گئی ہے اور نہ ہی اللہ ہی نے اپنے قانون میں اس کے جواز کی کوئی گنجائش رکھی ہے۔

جب تک رسول اللہ ﷺ دنیا میں موجود رہے اللہ کی زمین پر اللہ کے احکام وقوانین کی تنفیذ کی ذمہ داری ان پر رہی۔ ان کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری امت کے اولوالامر کی طرف منتقل ہوگئی۔ وہ اس بات کے مسئول قرار پائے کہ وہ اللہ کی زمین میں اللہ کے احکام وقوانین نافذ کریں۔ وہ خود بھی ان کی اطاعت کریں اور دوسروں سے بھی ان کی اطاعت کرائیں۔ یہ اولوالامر درحقیقت رسول اللہ کے خلفاء کی حیثیت رکھتے تھے اس لیے ان کی اطاعت واجب تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ. (نساء:۵۹)

﴿اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے اولوالامر کی﴾

اسلام نے اپنے نظام اطاعت میں اولوالامر کو یہ منصب جو دیا ہے تو اس وجہ سے دیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی تشریعی حاکمیت کے زمین میں نفاذ کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس امر کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ خود اللہ کے قانون کی اطاعت کریں اور اس کے بندوں کے اندر اس کے قانون کو جاری کریں۔ ان کو خود مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے:

۱۔ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہوں۔
۲۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو آخری دینی اور قانونی سند مانتے ہوں۔
۳۔ اسلام کے احکام وشرائع کے پابند ہوں۔
۴۔ تہذیب ومعاشرت میں اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہوں۔
۵۔ حلال وحرام میں اسلام کے مقرر کیے ہوئے حدود کے پابند ہوں۔
۶۔ وہ نہ خود اللہ کے قانون کی نافرمانی کریں نہ دوسروں کو ایسی بات کا حکم دیں۔

لادینی جمہوری ریاست کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ ایک ایسی ریاست ہوتی ہے کہ جس میں حاکمیت واختیار کے مالک جمہور ہوتے ہیں۔ انہی کی رائے سے قانون بنتے اور انہی کی رائے سے قوانین میں تغیر وتبدل ہوتا ہے۔ جس قانون کو وہ چاہیں وہی نافذ ہوتا ہے اور جسے وہ نہ چاہیں وہ منسوخ ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نام نہاد جمہوریت کے سائے میں عوام نہ خود قانون کو بناتے ہیں نہ خود

اس کو نافذ کرتے ہیں بلکہ وہ اس جمہوریت کے سسٹم کے تحت مجبور ہوتے ہیں کہ وہ اپنی حاکمیت کو چند مخصوص لوگوں کے سپرد کر دیں جو اپنی چالاکی، فریب دہی اور جھوٹے پراپیگنڈے کے زور پر عوام کو بیوقوف بناتے ہیں اور ان کے ووٹ حاصل کر کے ان کے نمائندے بن جاتے اور ان کی گردنوں پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے شخصی اور طبقاتی مفاد کے مطابق قانون بناتے ہیں اور عوام کی تفویض کی ہوئی طاقت سے عوام ہی پر نافذ کرتے ہیں۔ قطع نظر اس سے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہاں قانون عوام ہی کی مرضی سے بنتے ہیں تو عوام کی حالت تو یہ ہے کہ ان کی اکثریت اپنے نفع وضرر کا صحیح شعور نہیں رکھتی۔ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ اس کے اکثر فیصلوں پر جذبات وخواہشات اثر انداز ہوتے ہیں۔ عقل اور بصیرت کے تحت فیصلہ کرنے والے لوگ بہت کم تعداد میں ہوتے ہیں۔ عوام کی اکثریت اپنی حاکمیت اپنے نفس اور شیطان کے حوالے کر دیتی ہے۔ جمہوریت میں فیصلے چونکہ اکثریت کے بل پر ہوتے ہیں اس لیے بعض اوقات عوام کے فیصلوں پر جذبات اور خواہشات کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ ایسے قانون بھی منظور کر لیے جاتے ہیں جو صریحاً فطرت کے خلاف ہوتے ہیں۔

اسلامی ریاست میں حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے جو انسان کا خالق ومالک ہے۔ اس کو اپنی مخلوق کا بگاڑ نہیں بلکہ بناؤ مطلوب ہے۔ اس نے کائنات کے نظام کو عدل وقسط پر قائم فرمایا ہے۔ مجال نہیں کہ اس کے توازن میں کہیں کوئی خلل پیدا ہو جائے۔ اس کی یہی توازن پسندی ہماری زندگی کے اس دائرے کے لیے بھی ہے جس میں اس نے محدود قسم کی آزادی دی ہے۔ اس کے دیئے ہوئے اصولوں اور اس کے مقرر کردہ چار گوشوں کے اندر جو ریاست قائم ہوتی ہے وہی اسلامی ریاست ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست کوئی ایسی قومی جمہوریت نہیں جس میں ملک کا ہر باشندہ حاکمیت کا حصہ دار سمجھا جاتا ہو اور اسے اختیارات حاصل ہوں جن کو استعمال کر کے اپنی ہی تباہی اور بربادی کا سامان کر لے۔ بلکہ اسلامی ریاست ایک ایسی اصولی ریاست ہے جس میں ریاست کی تشکیل اور اس کو چلانے کی تمام ذمہ داریاں ان لوگوں پر عائد ہوتی ہیں جو اسلام پر ایمان رکھتے اور اسلامی ضابطۂ حیات کے پابند ہوتے ہیں۔ ان کو حاکمیت کا حق حاصل نہیں ہوتا بلکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ کی شریعت کی تنفیذ کریں اور اس مقصد کے لیے اللہ کے مقرر کیے ہوئے حدود اور اس کے ٹھہرائے ہوئے ضابطوں کے اندر رہتے ہوئے ایک سیاسی نظام تشکیل دیں۔ اس سے زیادہ ان کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ نہ اپنی مرضی سے وہ اللہ کے قانون سے بے نیاز ہو کر کوئی قانون بنا سکتے نہ اللہ اور رسول کی مقرر کردہ حدود کے باہر ہو کر کوئی سیاسی نظام قائم کر سکتے۔

اسلام میں قانون کے ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہی ہیں۔ جن چیزوں کے بارے میں

کتاب اور سنت کے اندر صریح احکام موجود ہیں ان میں مسلمانوں کے ارباب حل وعقد اور ان کے اولوالامر کا منصب ان قوانین کے اجراء اور نفاذ تک محدود ہے۔ وہ ان کے اندر نہ کسی ترمیم و تنسیخ کے مجاز ہیں نہ ان کی جگہ دوسرے قانون بنانے کا حق رکھتے ہیں لیکن جن معاملات میں سکوت اختیار کیا گیا ہے ان میں امت کو قانون بنانے کا پورا پورا حق دیا گیا ہے اور یہ حق نہایت وسیع دائرے میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ حالات وضروریات کے تحت پیش آنے والے تمام اجتماعی، سیاسی، اقتصادی اور انتظامی امور میں اسلام کے منشا اور مزاج کے مطابق قانون بنانا امت کے صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اس کے لیے ایک مکمل شورائی نظام خود کتاب وسنت کے اندر تجویز کیا گیا ہے جو مغربی جمہوریتوں کے نظام قانون سازی سے بدرجہا بہتر ہے۔ یہ نظام دور رسالت، دور صحابہؓ اور دور فقہاء میں قائم رہا۔ نبی ﷺ کو اگرچہ براہ راست وحی الٰہی کی رہنمائی حاصل تھی اور کسی معاملے میں مشورہ لینے کے محتاج نہ تھے لیکن شورائی نظام قانون سازی اور تدبیر مملکت کے نقطہ نظر سے ضروری تھا کہ نبی ﷺ اپنے طرز عمل سے اس کی بنیاد رکھیں۔ اس وجہ سے قرآن مجید میں یہ حکم دیا گیا ہے:

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ. (آل عمران:۱۵۹)

﴿پس ان سے درگزر کرو اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت چاہو اور ان سے معاملات میں مشورہ لیتے رہو۔﴾

چنانچہ نبی ﷺ جنگی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی ہر قسم کے معاملات میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیتے رہے۔ نبی ﷺ کے بعد جب صحابہؓ کا دور آیا تو ان کی رہنمائی کے لیے ان کے سامنے قرآن وحدیث اور اسوہ حسنہ موجود تھے جن میں سیاسی نظام قائم کرنے اور اس کو نافذ کرنے کے لیے واضح ہدایات موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں اصولی ہدایت دی گئی ہے:

وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ:۳۸)

﴿اور ان کا نظام باہمی مشورے پر مبنی ہے۔﴾

حدیث شریف میں اس کی وضاحت یوں آئی ہے:

حدثنی ابو سلمة ان النبی ﷺ سئل عن الامر یحدث لیس فی کتاب ولا سنة فقال ینظر فیه العابدون من المؤمنین. (سنن دارمی باب التورع عن الجواب فیما لیس فیه کتاب ولا سنة)

﴿ابو سلمہ نے بیان کیا کہ نبی ﷺ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی ایسا معاملہ آن پڑے جس کا ذکر

نہ تو قرآن میں ہو نہ سنت میں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا کہ اس معاملے پر مسلمانوں کے صالح لوگ غور کر کے اس کا فیصلہ کریں۔﴾

شورائی نظام کی ہدایت اللہ اور اس کے رسول نے فرمائی ہے تو ظاہر ہے کہ مجلس شوریٰ کی اکثریت جو بھی فیصلہ کرے گی اس کی پابندی لازمی ہوگی۔ امیر کو یہ اختیار نہیں ہوگا کہ وہ اس سے انحراف کرے البتہ اللہ اور رسول کے قطعی اور واضح احکام کی تنفیذ کے معاملے میں امیر شوریٰ سے مشورہ حاصل کرنے کا پابند نہیں بلکہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ صرف احکام کی تنفیذ کرے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں اکثر اہل الرائے مرکز میں موجود ہوتے تھے مملکت کا دائرہ بہت زیادہ وسیع نہ تھا۔ مدینہ منورہ میں دو قسم کے صحابہ موجود تھے۔ ایک وہ جن کی صلاحیتیں سیاسی، عسکری اور تبلیغی مہمات میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے کی وجہ سے لوگوں پر آشکارا تھیں۔ دوسرے وہ لوگ جنہیں قرآن کے علم وفہم اور تفقہ فی الدین کی وجہ سے امتیاز حاصل ہوا اور عوام الناس انہی کو سب سے زیادہ معتبر سمجھتے تھے۔ یہ دونوں قسم کے ممتاز صحابہ کرامؓ عملاً شوریٰ میں شامل ہوتے گئے اور یوں شوریٰ خود بخود تشکیل پائی اور رائے دہی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اور اگر رائے شماری ہوتی تو غالب امکان یہ تھا کہ یہی لوگ منتخب ہوتے۔ یہ شورائی نظام بہت سادہ اور بسیط قسم کا تھا۔ موجودہ دور کے حالات ابتدائی دور کے حالات سے بہت مختلف ہیں اس وجہ سے شوریٰ کو متعین کرنے کے لیے بعض ضروری اصلاحات کے ساتھ انتخاب کے جدید طریقوں کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح شوریٰ اور اولوالامر کے باہمی تعلقات کی تعیین کے لیے بھی ضروری قوانین بنائے جا سکتے ہیں اور ایسا کرنا انشاء اللہ اسلام کے منشا کے خلاف نہ ہوگا۔ مجلس شوریٰ کے ارکان کی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں، اس کے متعلق قرآن مجید نے یوں راہنمائی فرمائی ہے:

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ. وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ. (نساء:۸۳)

﴿اور جب ان کو کوئی بات امن یا خطرے کی پہنچتی ہے تو اسے پھیلا دیتے ہیں اور اگر یہ اس کو رسول اور اولوالامر کے سامنے پیش کرتے تو جو لوگ ان میں سے بات کی تہہ کو پہنچنے والے ہیں وہ اس کو اچھی طرح سمجھ لیتے۔﴾

اسلامی ریاست میں جن لوگوں کے سامنے معاملات پیش کیے جائیں، ان آیات میں ان کی تین خصوصیات بیان فرمائی گئی ہیں۔ ایک تو وہ مسلمانوں ہی میں سے ہوں، دوسرے وہ ان کے سربراہ کار ہوں اور تیسرے وہ معاملات کی سوجھ بوجھ اور دینی وسیاسی بصیرت کے مالک ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ

علماء وفقہاء ہی ہوں یا صرف وہ لوگ ہوں جنہیں خلیفہ یا امیر مشورہ کے لیے پسند کرے۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے اندر صاحب بصیرت لوگ وہی ہوں گے جو ملت کے خیر خواہ اور متقی ہوں، اسلام کے احکام و شرائع کے پابند ہوں، حلال و حرام میں تمیز رکھتے ہوں اور اسلام کی مقرر کی ہوئی حدوود کے پابند ہوں۔ اسلام میں ایسے مناصب کے لیے امیدوار ہونا حرام ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو ان مناصب کے لیے خود کو پیش کرتے ہیں، اپنی اہلیت کے اشتہار دیتے ہیں، تقریریں کرتے ہیں، بے تحاشا مال خرچ کرتے ہیں، لوگوں کو سبز باغ دکھاتے ہیں، قسمیں کھا کھا کر وعدے کرتے ہیں، ایسے لوگ ہرگز ہرگز شوریٰ کی رکنیت کے اہل نہیں۔

پس حقیقت میں نہ پارلیمانی جمہوریت اسلامی ہو سکتی ہے نہ صدارتی نظام۔ پارلیمانی نظام حکومت میں عملاً تمام اختیارات وزیر اعظم کے پاس ہوتے ہیں۔ صدر یا بادشاہ کی حیثیت ایک نمائشی گڈے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس کا کام صرف وزیر اعظم کے نامزد کردہ وزراء سے حلف لینا یا ریاست کے کچھ رسوم ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس نظام میں خرابی یہ ہے کہ یہ ایک پارٹی گورنمنٹ سسٹم ہوتا ہے۔ اکثریتی پارٹی یا کئی پارٹیوں کے اتحاد سے بننے والی اکثریت کا لیڈر وزیر اعظم بنتا ہے اور وہ اس وقت تک حکومت کرتا ہے جب تک اس کو ایوان میں اکثریت کا اعتماد حاصل رہے۔ اس اعتماد کو حاصل کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے نہ جانے اس کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ کس کس کے مطالبے پورے کرنے پڑتے ہیں۔ کہاں کہاں اصولوں کو قربان کیا جاتا ہے۔ رشوت، لالچ، جھوٹے وعدے اور بلیک میلنگ جیسے بے شمار حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ہر وقت اکثریت کا اعتماد کھو دینے کا دھڑ کا لگا رہتا ہے۔ چنانچہ ملک کا مفاد آخری ترجیح ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر پارٹی مضبوط ہوتی ہے تو حکمرانوں کے دماغ میں فرعونیت آجاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں ملک اور عوام کے مسائل سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ حکومت غیر مقبول ہو جاتی ہے۔ نہ اپنی اصلاح کی طرف توجہ دے سکتی ہے نہ جانے کا نام لیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی طالع آزما شب خون مارتا ہے اور اس کا بستر گول کر دیتا ہے۔ یہ حادثہ ہمارے ملک میں بار بار ہو چکا ہے۔ صدارتی نظام میں خرابی یہ ہے کہ اس نظام میں صدر جب ایک مرتبہ صدر بن گیا تو اس کے عہدے کی مدت کے اندر کوئی اس کو ہلا نہیں سکتا اگرچہ ایک ایک دوٹر اس کو ہٹانے کا مطالبہ کر رہا ہو۔ اسمبلی ہو یا کانگرس، اس کے غلط سے غلط اقدام پر گرفت کی مجاز نہیں ہوتی۔ اگر کچھ کر سکتی ہے تو اس کی راہ میں کچھ اڑنگے اور رکاوٹیں کھڑی کر سکتی ہے مگر ان رکاوٹوں سے صدر کی مطلق العنانی پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک میں بد امنی اور فساد برپا ہو جاتا ہے، قتل و غارت شروع ہو جاتا ہے، نراج

(Anarchy) پھیل جاتا ہے اور آخر خونی انقلاب کی نوبت آتی ہے۔ تیسری دنیا میں یہ تماشا آئے دن ہوتا رہتا ہے۔

ان کے مقابلے میں اسلامی نظام نہ تو پارٹی سسٹم کا محتاج ہوتا ہے اور نہ اسلامی حکومت کا امیر مطلق العنان ہوتا ہے۔ اسلام امیر کی غیر مسئولیت ایک لمحہ کے لیے بھی جائز تسلیم نہیں کرتا۔ اس کا انتخاب کرنے والے اس کا احتساب اور مواخذہ کر سکتے ہیں اور اگر محسوس کریں کہ امارت کے منصب کے لیے نا اہل ہے تو اس کو معزول کر سکتے ہیں۔ اسلامی ریاست زمین پر اللہ کی رحمت ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اقتدار سے نوازا ہے اور جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس وقت ملک کی زمام کار ہے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک میں اللہ کی حاکمیت کی تنفیذ کریں اور ایک صحیح اسلامی ریاست قائم کریں تاکہ ملک پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔ ہم ارباب سیاست سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی مسجدوں سے باہر آئیں، شخصیات کے بتوں کو توڑیں، طبقاتی مفادات سے بالاتر ہو کر، کندھے سے کندھا ملا کر اسلامی حکومت کے قیام کی طرف قدم بڑھائیں۔ انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کی نصرت شامل حال ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو زمین کی خلافت عطا فرمائے گا اور ان کی خوف کی حالت کو امن میں بدل دے گا۔ فرمایا ہے:

> وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ۚ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ. (النور:۵۵)
>
> ﴿تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک میں اقتدار بخشے گا جیسا کہ ان لوگوں کو اقتدار بخشا جو ان سے پہلے گزرے اور ان کے اس دین کو متمکن کرے گا جس کو ان کے لیے پسندیدہ ٹھہرایا اور ان کی خوف کی حالت کے بعد اس کو امن میں بدل دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور کسی کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو درحقیقت وہی لوگ نافرمان ہیں۔﴾

حمید الدین فراہیؒ / ترجمہ: ڈاکٹر عبید اللہ فراہی

مقدمہ تفسیر سورہ بقرہ

۔۲۔

۴۔ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ کعبہ کو مشرکین کے قبضہ سے آزاد کرانا تھا

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام سے تطہیر کعبہ کا عہد لیا تھا، جیسا کہ سورہ بقرہ میں فرمایا ہے:

''اور ابراہیم اور اسماعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔'' (بقرہ: ۱۲۵)

چنانچہ اس عہد کو پورا کرنا حضرت اسماعیلؑ کے وارث پر بھی لازم ٹھہرا، جیسا کہ سورہ نمل میں ہے:

''مجھے تو بس یہی حکم ملا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اسے محترم ٹھہرایا ہے اور اسی کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں فرماں برداری کرنے والوں میں سے ہوں''۔ (نمل: ۹۱)

اسی طرح تمام اہل ایمان کو اس عہد کا پابند بنایا گیا اور اسی وجہ سے ان پر قتال فرض کیا گیا۔ کیونکہ ابراہیمؑ نے جس طرح اپنے بعد ایک وارث کے لیے دعا فرمائی جو لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اسی طرح ایک امت ۔ کے لیے بھی دعا کی جو ان کے طریقہ پر کار بند ہو اور اس کو مسلم کے نام سے پکارا، جیسا کہ سورہ بقرہ میں بصراحت مذکور ہے:

''اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری ذریت میں سے اپنی ایک فرماں بردار امت اٹھا اور ہمیں ہمارے عبادت کے طریقے بتا اور ہماری توبہ قبول فرما۔ بے شک تو توبہ قبول کرنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے ہمارے رب! تو ان ہی میں سے ایک رسول ان میں مبعوث فرما......'' (بقرہ: ۱۲۸۔۱۲۹)

دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ انفال میں کس طرح مشرکین کی تولیت کو رد اور اہل ایمان کی تولیت کو ثابت کیا ہے۔ فرمایا ہے:

''اور اللہ ان کو کیوں نہ عذاب دے گا جب کہ وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں حالانکہ وہ اس کے متولی نہیں، اس کے متولی تو صرف اللہ سے ڈرنے والے ہو سکتے ہیں''۔ (انفال: ۳۴)

سورہ توبہ میں ہے:

''اے ایمان والو! مشرکین بالکل نجس ہیں تو یہ اپنے اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ پھٹکنے پائیں''۔ (توبہ: ۲۸)

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم دیا تھا کہ وہ مشرکین کو اس کے محترم گھر کے قریب نہ پھٹکنے دیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ اس عہد کو پورا کرنے کے بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے مکہ کے دروازے کھول دیے اور فتح سے ہم کنار کیا۔ اور اس کا وارث ایک ایسی امت کو بنایا جسے اسلام یعنی اپنی اطاعت کے لیے خاص کر لیا تھا۔ اس طرح اس نے حضرت ابراہیمؑ سے اپنے کیے ہوئے وعدہ کو پورا کر دیا۔ اور یہ جو اس نے اپنی جماعت کو مقدس سرزمین کا وارث بنایا تو یہ اس کی ایک سنت ہے۔ اس بحث کی تفصیل سورہ انبیاء کی تفسیر میں آیت ۱۰۵ کے تحت ملے گی:

''اور ہم نے زبور میں موعظت کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے''۔ (انبیاء: ۱۰۵)

اس کا اصل مقصد یہی تھا کہ لوگ نماز قائم کریں، جیسا کہ سورہ حج کی آیت میں، جو ہم نقل کر آئے ہیں، گزر چکا ہے۔ فرمایا ہے:

''ان لوگوں کو اگر ہم اس سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے''۔ (حج: ۴۱)

اس مضمون کی آیتیں اور بھی ہیں۔ اسی بات کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا میں اور اس سرزمین کی طرف جس مقصد کے تحت انہوں نے ہجرت کی تھی اس کے ذکر میں صراحت کے ساتھ کہہ دیا تھا۔ چنانچہ سورہ ابراہیم میں مذکور ہے:

''اور یاد کرو جب ابراہیمؑ نے دعا کی کہ اے میرے رب! اس سرزمین کو پرامن بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھ کہ ہم بتوں کی پوجا کریں''۔ (ابراہیم: ۳۵)

اس کے بعد بتوں کی برائی بیان کی، پھر فرمایا:

''اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد کو ایک غیر ذی زرع وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے رب، تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں۔ تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے (آپ کی یہ دعا حج کے سلسلہ میں تھی) اور ان کو پھلوں کا رزق عطا فرما تاکہ وہ تیرا شکر ادا کریں۔ (ابراہیم: ۳۷)

آگے اللہ تعالیٰ کی تعریف اور حمد بیان کی اور حسن طلب سے کام لیا، پھر فرمایا:

''اے میرے رب! مجھے نماز کا اہتمام کرنے والا بنا اور میری اولاد کو بھی، اے ہمارے رب! اور میری دعا قبول فرما''۔ (ابراہیم: ۴۰)

اس خاص اور لازمی عہد کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ اس محترم اور پر امن سرزمین کو مشرکین کے قبضہ سے واگزار کرائیں اور یہاں سے ان لوگوں کو ہٹا دیں جنہوں نے اللہ کے راستہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہیں، اس کی مسجد میں نماز پڑھنے سے روکا ہے اور رکوع وجود کرنے والوں کو صرف اس وجہ سے ان کے گھروں سے نکال دیا ہے کہ انہوں نے اللہ کو اپنا رب کہا اور شرک کو مسترد کر دیا، اور اس مقصد سے کہ وہ قلب کی پوری آمادگی کے ساتھ اس گھر کا رخ کریں اور اس کے علاوہ بعض دوسرے اسباب کی بنا پر اسے ان کا قبلہ بنایا جو کہ پہلا قبلہ تھا۔ لیکن تحویل قبلہ کو ایک مصلحت کے تحت، جسے ہم بیان کر چکے ہیں، اس عہد تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے موخر کر رکھا تھا، اگرچہ یہی اس کا بیت عتیق تھا، اور جب وہ وقت موعود آ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ایک علیحدہ امت کی حیثیت دے دی۔ یہاں اللہ کی ایک مخصوص جماعت بن کر تیار ہو گئی اور رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک دار یا جائے قرار ہو گیا اور آپ کے پیچھے چلنے والوں کا ایک گروہ بن گیا۔ اور یہ دونوں چیزیں قتال کے شرائط میں سے ہیں، جیسا کہ اس کے محل میں وضاحت ہو چکی ہے۔

بنی اسرائیل کے معاملہ میں بھی اسی جیسی صورت کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ کیا ہے۔ یہاں صرف اس کا خلاصہ پیش کرنے پر ہم اکتفا کریں گے۔

۵۔ بنی اسرائیل کے حالات سے اس کی مطابقت

معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت داؤدؑ بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد تک بنی اسرائیل کا کوئی قبلہ نہیں تھا سوائے تابوت سکینہ کے جسے وہ اٹھائے پھرتے اور اپنے خیموں کے اندر رکھتے رہتے تھے (دیکھیے تفسیر سورہ فیل) اور جب فلسطینیوں نے ان سے تابوت چھین لیا تو انہوں نے اپنے پیغمبر سے درخواست کی کہ ان کے لیے ایک امیر مقرر کر دیں جس کے ساتھ مل کر وہ جنگ کریں، جیسا کہ سورہ بقرہ میں ہے:

''کیا تم نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا موسیٰ کے بعد جب انہوں نے اپنے ایک نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک امیر مقرر کر دیجیے کہ ہم خدا کی راہ میں جہاد کریں۔ اس نے کہا ایسا نہ ہو کہ تم پر جہاد فرض کر دیا جائے تو تم جہاد نہ کرو۔ وہ بولے بھلا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے جب کہ ہم اپنے گھروں اور بچوں سے نکالے گئے ہیں''۔ (بقرہ: ۲۴۶)

چنانچہ ان کے پیغمبر صموئیل علیہ السلام نے طالوت کو ان پر بادشاہ مقرر کر دیا۔ صحابہ کرام اس بات کو جانتے تھے کہ غزوہ بدر میں ان کی مثال اصحاب طالوت جیسی ہے اور ان کی تعداد بھی انہیں کی تعداد کے بقدر ہے۔ یہ حضرت محمد ﷺ کی امت کے لیے جس وقت کہ وہ مکہ سے نکالے گئے تھے ایک مثال تھی۔ قرآن مجید میں اس بات کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کی کمی کے باوجود کس طرح ان کی مدد فرمائی۔ ایسا اس لیے ہوا کہ زمین پر سے فساد کا خاتمہ ہو اور وحدت، عدل اور احسان کے ذریعہ سلامتی اور آشتی قائم ہو، جیسا کہ ان پر قتال فرض کرتے وقت اس کی صراحت ان الفاظ میں سورہ بقرہ کے اندر کر دی ہے:

''اے ایمان والو! سب کے سب اسلام میں داخل ہو جاؤ'' (بقرہ: ۲۰۸)

اسی طرح سورہ محمد میں جہاں قتال کا ذکر آیا ہے فرمایا ہے:

''تو ایسا نہ ہو کہ تم ہمت ہار جاؤ اور مصالحت کی دعوت دینے لگو اور تم ہی سربلند ہو گے''۔ (محمد: ۳۵)

چنانچہ رسول اللہ ﷺ اہل ایمان کو کعبہ کو مشرکین سے آزاد کرنے پر ابھارتے، لوگوں کو سلامتی کی دعوت دیتے اور انہیں ایک خدائی حکومت کی طرف بلاتے رہتے تھے۔ ساتھ ہی حکمت اور احکام شریعت کی تعلیم دے کر ان کی تربیت بھی فرماتے تھے تاکہ وہ بیت اللہ کی وراثت اور اس کی امانت کے حق دار بن سکیں، ایک جان ہو جائیں اور لوگوں پر اللہ کے لیے گواہی دینے والے یعنی اس کی نیابت کرنے والے بن جائیں، جیسا کہ سورہ بقرہ میں فرمایا ہے:

''اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط بنایا ہے (یعنی جس طرح تمہارے قبلہ کو مشرق ومغرب کے چکر سے نکال کر وسط بنایا ہے) تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر تم پر گواہ ہو''۔ (بقرہ: ۱۴۳)

یہ عہد جو اس امت پر عائد ہوا ہے اس کی تفصیل سورہ آل عمران میں مذکور ہے۔ یہاں ہم اس کا ایک مختصر سا حصہ پیش کرنے جا رہے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کی کس طرح تربیت

فرمائی اور یہ بھی پتہ چل جائے کہ اس اہم معاملہ میں تدبیر الٰہی کی کیا کارفرمائی رہی۔

۶۔ اس مقصد کا مرکزی نقطہ للّٰہیت پر مبنی ملی اتحاد ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اہل کتاب کے اختلافات اور ان کے جمع مال کا بہت زیادہ ذکر کیا ہے اور اہل ایمان کو اس سے تختی کے ساتھ روکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ توحید کے بعد شریعت کا پہلا مطالبہ رحم دلی اور انسانی ہمدردی کا ہے، اور اختلاف شیطان کا پہلا حربہ ہے جس کے ذریعہ وہ قوموں کو گمراہی کے کھڈ میں دھکیل دیتا ہے۔ سورہ آل عمران خاص طور پر اسی بات کی تعلیم کے لیے رکھی گئی اور خلافت کے استحقاق کو اتحاد پر منحصر کیا گیا ہے جو اس تزکیہ سے عبارت ہے جس کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے دعا فرمائی تھی، اس باب میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہوں پر خبر دی ہے کہ یہ پیغمبر لوگوں کو کتاب (یعنی احکام شریعت) اور حکمت (یعنی مکارم اخلاق کے بنیادی امور) کی تعلیم دیتا ہے اور (تمام طرح کی آلائشوں سے پاک کر کے) ان کا تزکیہ کرتا ہے (اور انہیں نفس واحدہ بنا دیتا ہے۔ اس کی تفصیل اسی سورہ کی تفسیر میں آگے آتی ہے) اور تزکیہ ہی وہ چیز ہے جو تمام شریعت کو محیط ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں ہم کو ایسے سیاسی اور تمدنی احکام دیئے ہیں جو آپسی جھگڑوں کو ختم کرتے ہیں، صلح و آشتی پیدا کرتے ہیں اور ہمیں پاک صاف بناتے ہیں۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے کہ اس چیز کا ہمارے پیغمبر کی بعثت اور مسجد حرام سے کیا تعلق ہے، ہم سورہ آل عمران سے کچھ آیتیں نقل کرتے ہیں۔ فرمایا ہے:

> ''کہہ دو اللہ نے سچ فرمایا۔ پس ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرو جو بالکل یکسو تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا۔ بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے، اہل عالم کے لیے برکت اور ہدایت کا مرکز۔ وہاں واضح نشانیاں ہیں (یعنی اس بات کے دلائل اور نشانیاں ہیں کہ وہ پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے) مقام ابراہیم ہے، جو اس میں داخل ہو جائے وہ مامون ہے، اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج ہے جو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہیں اور جس نے کفر کیا تو اللہ دنیا والوں سے بے نیاز ہے''۔ (آل عمران: ۹۵-۹۷)

پھر اہل کتاب کی ان کوششوں کا ذکر کیا جو وہ اہل ایمان کو گمراہ کرنے کے لیے کر رہے تھے تاکہ وہ بھی ان ہی جیسے ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے خبردار کیا اور اس کے بعد فرمایا:

> ''اے ایمان والو، اللہ سے خوف کھاؤ جیسا کہ اس سے خوف کھانے کا حق ہے، اور تم کو موت آئے تو مسلمان ہونے کی حالت میں آئے۔ اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑ لو اور منتشر نہ ہو۔ اور اپنے اوپر اللہ کے اس فضل کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو باہم جوڑ دیا اور تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے (وہ آگ جو دشمنی اور آپس کی پھوٹ کی بنیاد تھی۔ عرب اس بات کو خوب جانتے تھے کہ جنگ ایک طرح کی آگ ہے اور اس کو بیشتر آگ ہی سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ دشمنی کی آگ جہنم ہی کی آگ کا ایک بڑا شعبہ ہے) تو اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیتوں کو واضح کرتا ہے تاکہ تم راہ یاب ہو۔ اور تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو نیکی کے کاموں کی طرف بلائے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ (یہ منصب شہادت کے فرائض کا بیان تھا جس کا اللہ تعالیٰ نے اس امت کو مکلف ٹھہرایا ہے) اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو افتراق و اختلاف میں پڑ گئے بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح ہدایات آ چکی تھیں''۔ (آل عمران: ۱۰۲-۱۰۵)

اس کے بعد اہل کتاب کے برے انجام کا ذکر کیا کیوں کہ انہوں نے فریضہ شہادت کو بالکل ضائع کر دیا تھا حالانکہ وہ لوگوں پر گواہ بنائے گئے تھے۔ پھر کلام کا رخ امت کے منصب کی خصوصیت بیان کرنے کی طرف مڑ گیا۔ چنانچہ فرمایا:

> ''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کی گئی ہے۔ معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔ (آل عمران: ۱۱۰)

یہ اسی مفہوم کا بیان ہے جو سورہ بقرہ میں ان الفاظ میں مذکور ہے:

> ''اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو''۔ (البقرہ: ۱۴۳)

ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کی یہی سنت رہی ہے کہ وہ قوموں میں سے کسی قوم کو اپنی حکمت اور عدل کے تقاضے سے منتخب کر لیتا ہے، اسے لوگوں پر گواہ بنا کر کھڑا کرتا ہے اور اس پر اپنی امانت کا بوجھ ڈالتا ہے۔ اگر وہ اس ذمہ داری کو پورا کرتے ہیں تو انہیں اقتدار اور غلبہ و نصرت سے اس وقت تک نوازتا رہتا ہے جب تک وہ اس عہد کو توڑ نہ دیں۔ اور جب وہ اس عہد کو توڑ دیتے ہیں تو ذلت و خواری کا طوق ان کی

گردن میں پڑ جاتا ہے۔ یہ بات قرآن مجید کی بہت سی سورتوں میں بیان ہوئی ہے اور تورات میں بھی اس کی صراحت موجود ہے۔ دیکھئے کتاب خروج (۱۹: ۵۔۶)

۷۔ پیغمبر ﷺ کے احوال اور اس مقصد میں مطابقت

رسول اللہ ﷺ کچھ عرصہ تک اپنے اصحاب کو کتاب وحکمت کی تعلیم دینے اور اسی چیز کے ذریعہ ان کا تزکیہ کرنے میں مصروف رہے جو انہیں اس بارگراں کے اٹھانے کے لائق بناسکے نیز اہل کتاب کے فتنوں اور ان کے اعمال کی برائیوں سے خبردار بھی کرتے رہے۔ اور جب وہ اللہ کے لیے گواہی دینے والے، اس کے عہد کے امین اور اس کے گھر کے پاسباں بن گئے تو مکہ کے دروازے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے کھول دیے اور ان کو وارث بنادیا اور زمین کا اقتدار انہیں سونپ دیا۔ اس طرح وہ خیر امت کا لقب پانے والے بن گئے اور ان پر وہ مثل صادق آگئی جو تورات اور انجیل میں ان کے متعلق بیان ہوئی ہے جیسا کہ سورہ فتح میں فرمایا ہے:

''محمد اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحم دل ہیں۔ تم ان کو دیکھتے ہو رکوع وسجود کرتے ہوئے، اللہ کے فضل (یعنی حکومت و خلافت اور کفار پر غلبہ تاکہ اللہ اور اس کی مخلوق سے محبت کے تقاضے ایک ساتھ پورے ہوں اور اللہ کی خاطر آپس میں بھائی بھائی بن جائیں) اور اس کی خوشنودی کے طلب گار بنے ہوئے (یعنی جنت کے، جو اس حال کے تابع ہے اور یہ عبارت ہے اس ملکوت الٰہی سے جس کا ذکر انجیل میں کثرت سے ہوا ہے۔ اس آیت کی تفسیر سورہ فتح میں دیکھئے) ان کی امتیازی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے نشان سے نمایاں ہے۔ یہ ان کی تمثیل ہے تورات میں، اور انجیل میں ان کی تمثیل یوں ہے کہ جیسے کھیتی ہو جس نے اپنے سرے نکالے پھر اس کو سہارا دیا پھر وہ سخت ہوئی اور اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی کسانوں کے دلوں کو بھاتی ہوئی تاکہ کافروں کا ان سے جی جلائے''۔ (فتح: ۲۹)

پھر کلام کا رخ وعدہ الٰہی کے ذکر کی طرف مڑ گیا اور اسے حسن عمل پر موقوف کیا۔ اس طرح ان کا غلبہ واقتدار اس بات کی دلیل بن گیا کہ وہ من حیث الامت منتخب قرار دیے گئے ہیں کیوں کہ حکومت اور فتح وکامرانی پوری جماعت کو عطا کی جاتی ہے۔ رہے افراد تو انہیں اپنے اعمال کے لحاظ سے پھل ملتا ہے اس وجہ سے کہ حکومت سے سرفراز کی جانے والی قوم میں کچھ گناہ گار ہوتے ہیں جس طرح پست کردی جانے والی

قوم میں بعض سزاوار رحمت ہوتے ہیں جیسے قوم فرعون کا بندہ مومن۔ چنانچہ فرمایا ہے:

''اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے''۔ (فتح: ۲۹)

اور یہ جو ہم نے اہل ایمان کے ساتھ فتح ونصرت اور غلبہ اور عہد شکنوں کے ساتھ ذلت وخواری اور لعنت کے لزوم کی بات کہی ہے تو یہ ایک عظیم الشان مسئلہ ہے جیسا کہ اپنی کتاب ''فی ملکوت اللہ'' میں ہم نے اس کی وضاحت کردی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس قوم کو اقتدار بخشا جاتا ہے اس کا محاسبہ اللہ تعالیٰ ضرور اس دنیا میں کرتا ہے، یہود کے احوال اور تورات اور قرآن کی شہادتوں پر غور کرنے سے اس معاملہ میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا۔

چنانچہ جب مکہ فتح ہوگیا اور وعدہ الٰہی آن پہنچی جس کا وعدہ تھا اور دین مکمل ہوگیا تو گویا پیغمبر نے اپنی رسالت کی ذمہ داریوں کو پورا کردیا اور اپنی بعثت کے مقصود ومنتہا تک پہنچ گئے۔ اب وقت آگیا کہ آپ اپنے رب کی طرف کوچ کریں۔ یہ بات ذی علم صحابہ کو معلوم تھی چنانچہ جب ''اذا جاء نصر اللہ والفتح ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا'' (سورہ النصر: ۱۔۲) نازل ہوئی تو جاننے والوں نے جان لیا کہ یہ آیات آپؐ کی وفات کی خبر دے رہی ہیں کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ہر شے کے لیے ایک مقررہ مدت اور حد ہے اور یہ کہ رسالت اپنے مقصد وغایت کے تکملہ کے قریب پہنچ چکی ہے۔ یعنی مکہ فتح ہوچکا اور دین ابراہیمی اپنے اصل محور پر لوٹ کر آگیا۔

۸۔ اپنے زمانہ نزول سے سورہ کی مطابقت

اس موضوع پر ہم نے بہت سرعت کے ساتھ نظر ڈالی ہے جس طرح کوئی تیز رفتار ہوا گزر جاتی ہے لیکن اگر آپ ان آیات پر غور کریں گے جو اوپر ہم نے نقل کی ہیں اور ان کا اس سورہ کی آیتوں سے مقابلہ کریں گے تو آپ پر یہ بات واضح ہوجائے گی کہ کعبہ کو مشرکین سے آزاد کرانا اور اسے شرک کی نجاستوں سے پاک صاف کرنا اس بعثت کی غرض وغایت تھی، نماز اس مقصد میں مرکزی اور بنیادی حیثیت رکھتی تھی، ذکر اور محبت الٰہی نیز مخلوق کے ساتھ ہمدردی اور ان کے اصلاح حال کی کوشش اس میں روح اور ایک داخلی حقیقت کی طرح کام کررہی تھی، حج اور دینی مملکت اس کی ظاہری صورت تھی اور پوری امت اس کے پایہ تخت کو اٹھائے ہوئے تھی۔ یہی سبب تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لوگوں کو گواہ کی حیثیت سے چن لیا اور ان سے جو کہا باندھا تھا اسے پورا کردیا جس طرح انہوں نے اس کے عہد کو پورا کیا تھا، جیسا کہ فرمایا ہے:

''یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو اس سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام

> کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے''۔ (الحج:۴۱)

اس طرح وہ اللہ کی مخلص برگزیدہ جماعت بن گئے جیسا کہ سورہ مجادلہ میں ان کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

> ''تم کوئی ایسی جماعت نہیں پاؤ گے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہو اور وہ دوستی رکھے ان سے جو اللہ اور اس کے رسول سے برسر مخالفت ہوں، اگرچہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا اہل کنبہ ہی میں سے کیوں نہ ہوں۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت فرما دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح کے ذریعہ ان کی تائید فرمائی ہے، اور ان کو داخل کرے گا ایسے باغوں میں جن کے اندر نہریں جاری ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی لوگ اللہ کی پارٹی ہیں۔ سن لو کہ اللہ کی پارٹی ہی فلاح پانے والی ہے''۔ (مجادلہ:۲۲)

ان اوصاف کی جھلک ہجرت کے وقت ہی دکھائی دینے لگی تھی۔ کیوں کہ جب انہوں نے اللہ کی طرف ہجرت کی تو خود اللہ کی شہادت کے مطابق ایسی جماعت بن گئے جس کے دل میں اللہ نے ایمان کو ثبت کر دیا اور اپنی طرف سے ایک روح غیبی کے ذریعہ ان کو تقویت پہنچائی۔ پس مہاجرین اور حزب اللہ المفلحین کے منصب کا کیا کہنا!

پھر یہ صفات غزوہ بدر میں پورے طور پر نمایاں ہو گئیں جب وہ اسلام کے دفاع کے لیے جہاد کرنے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہجرت میں اپنے اہل و عیال اور مال و منال کو چھوڑ دینے کے بعد اپنے رب کے لیے اپنی جان بھی نذر کر دی۔ اس طرح وہ اپنے باپ اور امام کی سنت کے مطابق خدا کے حضور قربانی پیش کرنے والے بن گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے گھر کا پاسباں اور اپنے عہد کا وارث بنا دیا، اور ان کے واسطے سے ساری قوموں کو برکت دی، جیسا کہ اپنے خلیل حضرت ابراہیمؑ سے وعدہ فرمایا تھا۔ اس حقیقت کو ہم اسی سورہ کی تفسیر میں آگے چل کر بیان کریں گے۔

معلوم ہوا کہ یہ سورہ تاویل و تنزیل دونوں ہی اعتبار سے ہجرت اور بدر کے واقعہ سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے۔ چنانچہ جس طرح ہجرت سے اسلام کی بندکونپل پھوٹی اور اس سے اس کی پتیاں نمودار ہوئیں، اور جس طرح بدر کا دن اس دین کے لیے نمود سحر ثابت ہوا اور اس میں اسلام کا جھنڈا بلند ہوا

اسی طرح سورہ بقرہ قرآن مجید کے عظیم الشان اور بلند پایہ مطالب کی حامل بنی، جیسا کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قول میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے۔

۹۔ مخاطبین کے احوال سے اس سورہ کی مطابقت

پچھلی فصل میں جو امور ہم نے بیان کیے ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس سورہ کا زمانہ نزول مخصوص حالات و مقتضیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے، چنانچہ جب ہم اس سورہ پر نظر ڈالتے ہیں تو خطاب کے مختلف رخ ہمارے سامنے کھل کر آ جاتے ہیں جن کو بہت ہی اختصار کے ساتھ اب ہم پیش کرنے جا رہے ہیں۔ یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس سورہ میں پیغمبر ﷺ، مومنین، اہل کتاب یعنی یہود اور تمام انسانوں سے خطاب ہے۔

۱۔ پیغمبرؐ کی طرف سے جو خطاب ہے وہ ایک تو آپؐ کی دل جوئی کے پہلو سے ہے کہ ان لوگوں سے قطع تعلق کر کے جو اپنے انکار پر مصر تھے آپ کو کچھ عرصہ کے لیے ہجرت کرنا پڑی اور دوسرا اس پہلو سے ہے کہ آپؐ اللہ اور اس کی کتابوں پر ایمان لانے والوں کے لیے معلم بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کی طرف خطاب اس پہلو سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک نئی آزاد امت کی حیثیت سے برپا کیا ہے تاکہ وہ لوگوں پر اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنیں، اس کی شریعت کے بار امانت کو اٹھائیں اور اس میں کامل ہوں، یہاں تک کہ اپنے بعد والوں کے لیے ایک نمونہ اور مثال بن جائیں۔

۳۔ اہل کتاب کو اس پہلو سے خطاب کیا گیا ہے کہ ان سے کوئی توقع اس بات کی نہیں کی گئی ہے کہ وہ عہد الٰہی کی پاسداری کریں گے اس لیے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے اور ان سے شریعت کی امانت واپس لی جا رہی ہے۔ البتہ ان کے لیے ایک راستہ کھلا رکھا گیا ہے کہ وہ دوسرا عہد باندھیں اور وہ یہ ہے کہ اس پیغمبر پر ایمان لائیں تاکہ خدا ان پر پھر سے مہربان ہو، جیسا کہ تورات میں بہت سی جگہوں پر اس کا ذکر آیا ہے اور سورہ اعراف میں بھی اس کی صراحت موجود ہے۔

۴۔ اور تمام بنی نوع انسان سے جو خطاب کیا گیا ہے وہ ان کو دعوت توحید دینے کے پہلو سے ہے جو کہ دین کی اساس ہے، اور اس پہلو سے بھی ہے کہ انہیں صلح و تقویٰ اور منعم و رحمٰن اور مہربان خدا کی اطاعت کی طرف بلایا جائے جو کہ تمام سعادتوں کا جامع ہے۔

سورہ کے اندر ان خطابات کی ترتیب نظم کلام کے تقاضے کے مطابق ہے، ہم نے ان کو مخاطب کے درجات کی ترتیب کے لحاظ سے ذکر کیا ہے۔ اور جہاں تک اس سورہ کے اندرونی نظام کا معاملہ ہے تو اس کا تذکرہ اگلی فصل میں آ رہا ہے۔

امین احسن اصلاحیؒ

درس صحیح بخاری

(کتاب الوکالہ کی روایات)

۲. باب الوکالة فی قضاء الدیون

باب: قرضوں کی ادائیگی کے بارے میں وکالت

یہ موضوع کچھ زیادہ اہم نہیں۔ وکیل جب ہوسکتا ہے تو ہر چیز میں ہوسکتا ہے، قرضوں کی ادائیگی میں کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو اس میں رکاوٹ بن جائے۔

۷. حدثنا سلیمان بن حرب حدثنا شعبة عن سلمة بن کھیل سمعت ابا سلمة بن عبدالرحمن عن ابی ھریرة اَنَّ رَجُلًا اَتَی النبیَّ ﷺ یَتَقَاضَاهُ فَاَغْلَظَ فَهَمَّ بِهٖ اَصْحَابُهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ دَعُوهُ فَاِنَّ لِصَاحِبِ الحقِ مَقَالًا ثُمَّ قَالَ اعطوهُ سِنًّا مِثْلَ سِنِّهٖ قالوا یَا رَسُوْلَ اللّٰه اَلَا اَمْثَلَ مِن سِنِّهٖ فَقَالَ اَعْطُوهُ فَاِنَّ مِنْ خَیْرِکُمْ اَحْسَنَکُم قَضَاءً.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے پاس ایک شخص تقاضا کرتے ہوئے آیا اور کچھ سخت لہجہ اختیار کیا۔ صحابہ نے چاہا کہ اسے دبوچ لیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسا نہ کرو۔ جس کا کچھ حق نکلتا ہے اس کو کچھ کہنے کا بھی حق ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اس کے اونٹ کے مانند اونٹ سے اس کو ادائیگی کر دو۔ صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ (اس سن کا اونٹ تو نہیں ہے) کیا اس کو اس سے بہتر سن کا اونٹ نہ دے دیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا وہی دے دو۔ تم میں اچھے وہی لوگ ہیں جو واجبات خوبی کے ساتھ ادا کریں۔

وضاحت: یہ روایت اور وہ روایت جو اوپر گزری ہے دونوں ایک ہی ہیں۔ البتہ اس میں کچھ وضاحتیں اور کچھ اضافے ہیں۔ امام صاحب نے اس کو الگ باب میں رکھ دیا ہے حالانکہ ایک ہی روایت ان سارے پہلوؤں کو، جن کو وہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں، شامل کر لیتی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی ہے کہ جس کا کچھ حق بنتا ہے اس کو کچھ کہنے کا بھی حق

حاصل ہوتا ہے۔ پھر آپ نے واجبات کی ادائیگی بہتر طور پر کرنے کی ترغیب دی۔

۷. باب: اذا وھب شیأ لوکیل او شفیع قوم جاز لقول النبی ﷺ لوفد ھوازن حین سالوہ المغنم فقال النبی ﷺ نصیبی لکم.

باب: آدمی جب کسی وکیل کو یا قوم کے کسی شفیع کو کچھ دے تو ایسا کرنا جائز

ہوگا۔ یہ نبی ﷺ کے اس ارشاد کی روشنی میں ہے جو قبیلہ ہوازن کے اس وفد سے آپ نے فرمایا تھا جو اپنی غنیموں کا مطالبہ کرنے آئے تھے کہ میرا جو حصہ ہے وہ تو میں تمھیں دیتا ہوں۔

وضاحت: یہاں جس طریقہ سے واقعہ کو اختصار سے بیان کیا ہے اس سے کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ نبی ﷺ طائف کے محاصرہ کے بعد مکہ کو لوٹے تو راستہ میں قبیلہ ہوازن کا معاملہ ابھی فیصلہ طلب تھا۔ ان کے ساتھ جنگ ہوئی تھی جس میں ہوازن کو شکست ہوئی۔ ان کا بہت سا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا اور بہت سے قیدی پکڑے گئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کا کئی دن تک انتظار کیا لیکن جب وہ نہیں آئے تو مال غنیمت تقسیم کر دیا گیا۔ بعد میں وہ تائب ہو کر آئے اور کہا کہ ہمارے قیدی اور ہمارا مال سب واپس کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا پکی بات کہتا ہوں، تم کو اب مال یا قیدیوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ دونوں کی واپسی کا امکان نہیں ہے۔ حضور کے اس جواب پر ہوازن نے سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمارے قیدی واپس کر دیے جائیں۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ جو حصہ میں لے چکا ہوں وہ تم واپس لو۔ یہ فرما کر آپ نے مسلمانوں کے لیے ایک مثال قائم کی کہ وہ بھی اپنے حصے واپس کر دیں۔ مزید براں قیدیوں کی واپسی کے لیے آپ نے یہ انتظام فرمایا کہ لیڈروں کو بلا کر ان کو صورت حال سے آگاہ فرمایا تو انہوں نے کہا ہمارا مال و جان سب آپ پر فدا۔ اگر حضور اپنا حصہ ہوازن کو واپس کرتے ہیں تو ہم بھی واپس کرتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے ہوازن کے فیصلہ کا کیوں انتظار فرمایا۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عرب یعنی بنی اسماعیل تھے۔ بنی اسماعیل کے بارے میں مشکل یہ تھی کہ وہ غلام نہیں بنائے جاسکتے تھے۔ یہ کسی شرف کی بنا پر نہیں بلکہ اس قانون کی بنا پر تھا کہ جس قوم کی طرف رسول کی بعثت براہ راست ہوتی ہے اس کے لیے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ اگر رسول پر ایمان لائیں تو فبہا، یہی مقصود ہے۔ اور اگر ایمان نہ لائیں تو آپ ان سے جنگ کیجئے اور ان کو ختم کر دیجئے یا وہ آپ سے لڑ کر خود ختم ہو جائیں۔ اس اصول کو اچھی طرح ذہن میں بٹھا لیجئے ورنہ آپ کو قدم قدم پر مشکلیں پیش آئیں گی اور

واقعات کی توجیہ صحیح طور پر نہیں ہو سکے گی۔

ہوازن جب تک فیصلہ نہیں کر پائے کہ اسلام قبول کرتا ہے یا نہیں تو حضور نے ان کے معاملہ میں توقف فرمایا۔ جب انہوں نے دیر لگائی تو بالآخر آپ نے مال غنیمت تقسیم کر دیا۔ اس طرح معاملہ آپ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ہوازن تائب ہو کر اسلام قبول کرنے آئے تو انہوں نے اپنا مال بھی واپس مانگا۔ تب حضور نے اپنا حصہ پیش کر دیا۔

امام صاحب نے 'نصیبی لکم' کے الفاظ سے وکیل کو ہبہ کرنے پر جو استدلال کیا ہے تو یہ اس واقعہ سے ثابت نہیں ہوتا۔ یہ نہ کوئی ہدیہ تھا نہ عطیہ۔ یہ تو آپ نے اپنا وہ حصہ واپس کیا جو تقسیم غنائم میں آپ کو ملا تھا۔

٨۔ حدثنا سعید بن عفیر قال حدثنی اللیث قال حدثنی عقیل عن ابن شہاب قال و زعم عروة ان مروان بن الحکم و المسور بن مخرمة اخبره' اَنَّ رسولَ اللّٰہِ ﷺ قام حِینَ جاء ہ' وفدُ ھوازِنَ مسلمینَ فَسَألُوہُ اَنْ یَرُدَّ اِلَیھِم اَموالَھُمْ و سَبْیَھُم فقالَ لَھُم رسولُ اللّٰہِ ﷺ اَحَبُّ الحدیثِ اِلَیَّ اَصدقُہ' فاختارُوا اِحدَی الطَّائِفَتَینِ اِمَّا السَّبیَ و اِمَّا المَالَ وقد کُنتُ استَانَیتُ بِھِم و قد کانَ رسولُ اللّٰہِ ﷺ انتَظَرَھُم بِضعَ عَشرَةَ لَیلَةً حِینَ قَفَلَ مِنَ الطَّائِفِ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّ رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ غیرُ رَادٍّ اِلَیھِم اِلَّا اِحدَی الطَّائِفَتَینِ قالُوا فَاِنَّا نَختارُ سَبیَنَا فقامَ رسولُ اللّٰہِ ﷺ فِی المُسلِمینَ فَاَثنٰی عَلَی اللّٰہِ بِمَا ھُوَ اَھلُہ' ثُمَّ قالَ اَمَّا بَعدُ فَاِنَّ اِخوانَکُم ھٰؤلاءِ قد جَاءُونَا تَائِبِینَ وَ اِنِّی قد رَأَیتُ اَنْ اَرُدَّ اِلَیھِم سَبیَھُم فَمَنْ اَحَبَّ مِنکُم اَنْ یُطَیِّبَ بِذٰلِکَ فَلیَفعَلْ وَمَنْ اَحَبَّ مِنکُم اَن یَکُونَ عَلٰی حَظِّہٖ حَتّٰی نُعطِیَہ' اِیَّاہُ مِنْ اَوَّلِ مَا یُفِیءُ اللّٰہُ عَلَینَا فَلیَفعَلْ فقالَ النَّاسُ قد طَیَّبنَا ذٰلِکَ لِرَسُولِ اللّٰہِ ﷺ لَھُمْ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّا لَا نَدرِی مَنْ اَذِنَ مِنکُمْ فِی ذٰلِکَ مِمَّنْ لَمْ یَاذَنْ فَارجِعُوا حَتّٰی یَرفَعُوا اِلَینَا عُرَفَاءُکُم اَمرَکُم فَرَجَعَ النَّاسُ فَکَلَّمَھُم عُرَفَاءُھُم ثُمَّ رَجَعُوا اِلٰی رَسُولِ اللّٰہِ ﷺ فَاَخبَرُوہ' اَنَّھُم قد طَیَّبُوا و اَذِنُوا۔

ترجمہ: ابن شہاب سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ عروہ کا گمان ہے کہ مروان بن حکم اور مسور بن مخرمہ دونوں نے ان کو خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب اسلام لا کر ہوازن کا وفد آیا اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ ان کے قیدی اور ان کے مال واپس کر دیے جائیں تو نبی ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ سچ بات

کہنا مجھے پسند ہے، اب تم دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر لو، قیدی واپس لے لو یا مال۔ اور میں نے ان کے بارے میں خاصا توقف کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی ﷺ جب طائف سے لوٹے تو دس راتوں سے زیادہ ان کا انتظار کیا تھا۔ جب ان لوگوں پر حقیقت واضح ہو گئی کہ رسول اللہ ﷺ دونوں چیزوں میں سے صرف ایک چیز لوٹانے والے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ہم اپنے قیدی لینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ مسلمانوں میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی ثنا اس کے شایان شان بیان کی پھر فرمایا: اما بعد لوگو، یہ تمہارے بھائی ہیں جو تائب ہو کر تمہارے پاس آئے ہیں اور میری رائے یہ ہے کہ ان کے قیدی لوٹا دیے جائیں تو تم میں سے جو بطیب خاطر منظور کر لیں ان کو تو چاہیے کہ ان کے قیدی لوٹا دیں اور تم میں سے جو اپنے حصہ پر قائم رہنا چاہیں یہاں تک کہ جو اول مال غنیمت آئے ہم اس سے ان کو معاوضہ دیں تو وہ ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ تو لوگوں نے کہا ہم آپ کے فیصلہ پر راضی ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا میں متعین نہیں کر پا رہا ہوں کہ کتنے راضی ہیں اور کتنے نہیں، تو جاؤ اور تمہارے فیصلہ سے تمہارے سردار ہمیں آگاہ کریں۔ تو وہ سب لوگ لوٹے۔ ان کے سرداروں نے ان سے بات کی اور واپس آ کر رسول اللہ ﷺ کو خبر دی کہ ان لوگوں نے خوشی سے قیدی لوٹانے کی اجازت دی ہے۔

وضاحت: اس روایت کا سارا پس منظر باب کی وضاحت میں بیان ہو چکا ہے۔ ہوازن کے قیدیوں کا معاملہ طائف سے واپسی کے دوران پیش آیا تھا۔ روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے کہا کہ استانیت بھم یعنی معاملہ طے کرنے میں میں نے بہت توقف کیا کہ تم لوگ آ جاؤ۔ بضع عشرة لیلة کے الفاظ ہیں یعنی دس راتوں سے کسی قدر زاید انتظار کیا اور پھر اس کے بعد قیدی اور مال تقسیم کر دیے گئے۔ جب ہوازن کے لوگ تائب ہو کر اور اسلام قبول کر کے آئے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ احدی الطائفتین یعنی دونوں میں سے ایک 'قیدی یا مال' واپس ہو سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ذہن میں تھا کہ عرب ہیں، اپنے قیدیوں ہی کو لیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ جو فرمایا کہ جو معاوضہ لے کر واپس کرنا چاہتا ہے تو جو اول مال غنیمت آئے گا ہم اس میں سے اس کو دیں گے تو یہ لوگوں کی دلداری کے لیے تھا۔ اس لیے کہ کس کی مجال تھی کہ قیدیوں کو واپس نہ کرتا، اور سب لوگوں نے بطیب خاطر ان کو واپس کر بھی دیا۔ آنحضرت ﷺ کا پہلا ہی فقرہ کافی تھا کہ میرا جو حصہ ہے وہ واپس کرتا ہوں۔ اس مثال کے قائم ہو جانے کے بعد کون پیچھے رہ سکتا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے اتنا انتظار کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ عربوں کا معاملہ تھا جو اسلام یا تلوار ہی پر ختم ہو سکتا تھا۔ اس کے حل کی کوئی تیسری شکل نہ تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس سلسلے کو بالکل

ہی ختم کر دیا۔ یہاں تک کہ عرب کا ایک قبیلہ عیسائی ہوگیا تو وہ ان کو ان کی عیسائیت کی بنا پر ذمی بنانے پر راضی نہ تھے، کیونکہ وہ بنی اسماعیل تھے۔

۸۔ باب: اذا وكل رجل رجلا ان يعطي شياء و لم يبين كم يعطي فاعطي ما يتعارفه الناس

باب: جب آدمی کسی شخص کو وکیل بنائے کہ وہ کوئی چیز دے دے اور اس نے یہ نہیں بتایا کہ کتنی دے تو وہ لوگوں کے دستور کے مطابق دے

۹۔ حدثنا المكي بن ابراهيم حدثنا ابن جريج عن عطاء بن ابي رباح وغيره يزيد بعضهم على بعض و لم يبلغه كلُّهُم رجل" واحد" منهم عن جابرِ بْنِ عبدِاللّٰهِ قال كنتُ مع النَّبِيِّ ﷺ في سَفَرٍ فكُنْتُ عَلٰى جملٍ ثفالٍ انما هو في اخر القوم فمرّبي النبيُّ ﷺ فقَالَ من هذا فقلتُ جابرُ بن عبداللّٰهِ قال مالكَ قُلتُ اني على جملٍ ثفالٍ قال امعكَ قضيب" قُلتُ نعم قال اعطنيه؟ فَاَعْطَيْتُه' فضَرَبَه' فزَجره' فكانَ من ذالكَ المكانِ من اولِ القومِ قال بعنيه فقُلتُ بل هو لكَ يا رَسُولَ اللّٰهِ قال بعنيه قد اَخذتُه' بِاَربعةِ دَنانيرَ وَلكَ ظهرُه' اِلى المدينةِ فلَمَّا دَنونا مِنَ المدينةِ اَخذتُ اَرتحِلُ قالَ اَينَ تُريدُ قُلتُ تَزَوَّجتُ امْرَاَةً قد خلا منها قالَ فهلّا جاريَةً" تُلاعِبُهَا و تُلاعِبُكَ قُلتُ اِنَّ اَبِي تُوُفّي و تَرَكَ بناتٍ فاردتُ اَنْ انكِحَ اَمْرَاَةً قد جربت خلا منها قالَ فذالِكَ فلَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِينَةَ قال يا بِلالُ اقْضِهِ وَزِدْهُ فاَعْطَاهُ اَربَعَةَ دَنانِيرَ وَزَادَه' قيراطًا قال جابر" لا تُفارِقُني زِيادةُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فلم يكُنِ الْقيراطُ يُفارِقُ قِرابَ جابرِ بن عبداللّٰهِ رضي اللّٰهُ تعالىٰ عنه.

ترجمہ: عطاء بن ابی رباح وغیرہ سے روایت ہے۔ ان میں سے بعض بات زیادہ کرتے تھے لیکن پوری کسی نے بھی بیان نہیں کی۔ وہ جابر بن عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا۔ میں ایک سست رفتار اونٹ پر سوار تھا جو سب لوگوں کے بالکل پیچھے تھا۔ نبی ﷺ کا مجھ پر گزر ہوا تو آپ نے پوچھا کون ہے، میں نے کہا جابر بن عبداللہ۔ آپ نے پوچھا کیا ماجرا ہے؟ میں نے کہا میرا اونٹ بہت سست ہے۔ آپ نے پوچھا تمہارے پاس کوئی چھڑی ہے میں نے کہا جی ہاں ہے۔ فرمایا مجھ کو

دو۔ میں نے دی تو آپ نے اسے رسید کی اور ڈانٹا۔ اب وہ تمام لوگوں سے آگے پہنچ گیا۔ آپ نے فرمایا یہ اونٹ مجھے بیچ دو۔ میں نے کہا نہیں بلکہ میں اسے آپ کی نذر کرتا ہوں۔ تو آنحضرت ﷺ نے کہا نہیں، بیچ دو، میں چار دینار میں تم سے لیتا ہوں اور تم کو یہ اجازت ہوگی کہ مدینہ تک تم اس پر سوار ہو کر جاؤ۔ جب ہم مدینہ کے قریب پہنچے تو میں نے الگ راہ لی تو آپ نے فرمایا کہاں چلے۔ میں نے کہا میں نے شادی کی ہے ایک بیوہ سے۔ آپ نے فرمایا کسی نوخیز سے شادی کی ہوتی۔ وہ تمہاری خوش بختی کا ذریعہ ہوتی، تم اس کو خوش بخت کرتے۔ میں نے کہا میرے باپ نے وفات پائی تو سات بیٹیاں چھوڑیں۔ میں نے چاہا کسی ایسی عورت سے نکاح کروں جو تجربہ کیے ہوئے ہو تو میں نے بیوہ سے نکاح کیا۔ آپ نے فرمایا یہی چاہیے تھا۔ جب ہم مدینہ پہنچے تو آنحضرت ﷺ نے بلالؓ سے کہا ان کی قیمت ادا کردو اور کچھ زیادہ دینا تو انہوں نے چار دینار دیے اور ایک قیراط زیادہ کیا۔ جابر بن عبداللہ بتاتے تھے کہ وہ قیراط ہمیشہ میرے پاس رہتا ہے۔ وہ اس قیراط کو بٹوے میں ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔

وضاحت: یہ روایت پیچھے گزری ہے اور اس کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ سفر کے دوران آنحضرت ﷺ پیچھے سے گشت کرتے آرہے تھے اور یہ دیکھ رہے تھے کہ کون کہاں ہے۔ یہ انداز تھا آنحضرت ﷺ کا اپنے صحابہؓ کے درمیان۔ یہ نہیں کہ اپنے پروٹوکول کے اندر رہتے ہوں۔ حضرت جابرؓ نے اونٹ حضور کی نذر کرنا چاہا تو آپ نے مفت لینا پسند نہیں کیا اور کہا کہ چار دینار میں مجھے دے دو اور ان کو اجازت دی کہ مدینہ تک کا سفر وہ اس پر کر سکتے ہیں۔ اللہ اکبر، یہ کردار اور یہ اخلاق! اس کے ساتھ آپ لوگوں کے دلوں میں نہ رہتے تو اور کہاں رہتے، سب کے دلوں میں تھے۔ کون ہے جو ان کی نافرمانی کرتا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت جابرؓ سے یہ سوال جو کیا کہ بیوہ کی بجائے کسی نوخیز سے شادی کیوں نہ کی تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سوال آپ نے جابر رضی اللہ عنہ کے باطن کو سامنے لانے کے لیے کیا تھا کہ ان کی کیا سوچ ہے۔ حضرت جابرؓ کے جواب کا مطلب یہ تھا کہ سات بہنیں ہیں، ان ہی کی ہم عمر لا کر بٹھا دیتا تو گھر کو کون دیکھتا اس لیے ایک بیوہ سے شادی کی ہے۔ آنحضرت ﷺ کا جواب میں فذلک فرمانا یعنی ہاں یوں ہی چاہیے تھا، نہایت ہی بلیغ ہے۔ ترجمہ میں بات نہیں آسکتی، اس بلاغت پر میں تنہائی میں داد دیتا اور سر دھنتا رہا۔

مدینہ پہنچنے پر آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو ہدایت کی کہ ان کی قیمت ادا کردو اور کچھ زیادہ کر دینا تو حضرت بلالؓ نے چار دینار دیے اور ایک قیراط زیادہ دیا۔ یہ ایک قیراط حضرت جابر تبرک کے طور پر اپنے بٹوے میں رکھتے تھے اور ہمیشہ ان کے ساتھ رہا۔ روایت میں آتا ہے کہ جب شام کی جنگیں

ہوئیں اور سپاہی آپس میں گتھم گتھا ہوئے تو اس میں جابرؓ شہید ہو گئے اور شامیوں نے وہ قیراط اپنے قبضہ میں کر لیا۔

امام صاحب نے باب باندھا ہے کہ کوئی شخص وکیل کو کہے کہ کوئی چیز دے دے لیکن یہ نہ بتائے کہ کتنا دینا ہے۔ یہاں روایت میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت جابرؓ سے صاف کہا کہ یہ اونٹ چار دینار میں لیتا ہوں تو حضرت بلالؓ کو اس کا علم رہا۔ تبھی تو انہوں نے چار ہی دینار قیمت ادا کی اور ایک قیراط بطور اضافہ دیا۔ لہٰذا روایت باب سے مطابقت نہیں رکھتی۔

۹ . باب: وكالة الامراة الامام فى النكاح

باب کسی عورت کا خلیفہ کو نکاح میں وکیل کرنا

۱۰ . حدثنا عبدالله بن يوسف اخبرنا مالک عن ابی حازم عن سهل بن سعد قال جَاءَتْ امْرَأَةٌ" إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ انی قد وَهَبْتُ لَکَ مِن نَفْسِي فقَالَ رجل" زَوِّجْنِيهَا قَالَ قد زَوَّجْتُكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرانِ.

ترجمہ: سہل بن سعد سے روایت ہے کہ ایک خاتون رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئیں اور کہا یا رسول اللہ: میں اپنے آپ کو آپ کے ہبہ کرتی ہوں۔ ایک شخص بولا یا رسول اللہ! اس کا نکاح مجھ سے کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا اس قرآن کے بدل جو تجھ کو یاد ہے میں نے اس کا نکاح تجھ سے کر دیا۔

وضاحت: ہبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مہر وغیرہ کا میرا کوئی مطالبہ نہیں ہے اور میں اپنے آپ کو آپ کے نکاح میں دیتی ہوں۔ قرآن کی سورہ احزاب کی رو سے آپ کے لیے یہ جائز تھا کہ کوئی خاتون اپنے کو آپ کے لیے ہبہ کر دے تو آپ اس سے نکاح کر لیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس خاتون کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ دوسری روایت میں آتا ہے کہ آپ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ یہ تردد دیکھ کر ایک شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ! اس کا نکاح مجھ سے کر دیجئے تو آپ نے اس سے پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ دینے کو ہے۔ اس نے کہا کچھ نہیں۔ آپ نے پوچھا لوہے کی ایک انگوٹھی بھی نہیں۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ میرے پاس تو صرف ایک تہمد ہے۔ آپ نے پوچھا قرآن کتنا یاد ہے تو اس نے بتایا کہ اتنا یاد ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اس کے بدلے میں تمہارا نکاح میں نے اس خاتون سے کر دیا۔

۱۰ . باب: اذا وكل رجلا فترك الوكيل شيأ فاجازه الموكل فهو جايز و ان اقرضه الى اجل مسمى جاز

و قال عثمان بن الهيثم ابو عمر و حدثنا عوف عن محمد بن سيرين عن ابی هريرةؓ قال وكلنی رسول الله ﷺ بحفظ زكوة رمضان فاتانی ات فجعل يحثوا من الطعام فاخذته و قلت والله لا رفعنک الى رسول الله ﷺ قال انی محتاج و على عيال ولی حاجة شديدة قال فخليت عنه فاصبحت فقال النبی ﷺ يا اباهريرة ما فعل اسيرک البارحة قال قلت يا رسول الله شكا حاجة شديدة و عيالا فرحمته فخليت سبيله قال اما انه قد كذبک و سيعود فعرفت انه سيعود لقول رسول الله ﷺ انه سيعود فرصدته فجاء يحثوا من الطعام فاخذته فقلت لا رفعنک الى رسول الله ﷺ قال دعنی فانی محتاج و على عيال لا اعود فرحمته فخليت سبيله فاصبحت فقال لی رسول الله ﷺ يا ابا هريرة ما فعل اسيرک قلت يا رسول الله شكا حاجة شديدة و عيالا فرحمته فخليت سبيله قال اما انه قد كذبک و سيعود فرصدته الثالثة فجاء يحثوا من الطعام فاخذته فقلت لا رفعنک الى رسول الله ﷺ و هذا اخر ثلث مرات انک تزعم لا تعود ثم تعود قال دعنی اعلمک كلمات ينفعک الله بها قلت ما هو قال اذا اويت الى فراشک فاقرأ اية الكرسی الله لا اله الا هو الحی القيوم حتى تختم الاية فانک لن يزال عليک من الله حافظ ولا يقربنک شيطان حتى تصبح فخليت سبيله فاصبحت فقال لی رسول الله ﷺ ما فعل اسيرک البارحة قلت يا رسول الله زعم انه يعلمنی كلمات ينفعنی الله بها فخليت سبيله قال ما هی قلت قال لی اذا اويت الى فراشک فاقرأ اية الكرسی من اولها حتى تختم الله لا اله الا هو الحی القيوم و قال لی لن يزال عليک من الله حافظ و لا يقربک شيطان حتى تصبح و كانوا احرص شئ على الخير فقال النبی ﷺ اما انه قد صدقک و هو كذوب تعلم من تخاطب من ثلث ليال يااباهريرةؓ قال لا قال ذاک شيطان.

جب کسی شخص نے کسی کو وکیل بنایا اور وکیل نے کسی بات کو چھوڑ دیا اور موکل نے اس کی اجازت دے دی تو یہ جائز ہے۔ اور اگر خاص مدت تک قرض

بھی دے دے تو وہ بھی جائز ہے۔ محمد بن سیرین، ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے رمضان کی زکوۃ کی حفاظت پر مامور کیا۔ ایک آنے والا آیا اور وہ لپ بھر بھر کر اناج اٹھانے لگا۔ میں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا کہ میں تمہارا معاملہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ اس نے کہا میں محتاج ہوں۔ میرے اوپر عیال کا بوجھ ہے اور مجھے شدید ضرورت تھی۔ تو میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی تو نبی ﷺ نے فرمایا ابو ہریرہؓ رات تمہارے قیدی کا کیا ماجرا ہوا۔ میں نے کہا یا رسول اللہ اس نے اپنی ضرورت بیان کی اور عیال کی شکایت کی تو مجھے رحم آ گیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا آگاہ رہو کہ اس نے تم سے جھوٹ کہا اور وہ پھر آئے گا۔ مجھے گمان رہا کہ وہ ضرور آئے گا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا تو میں اس کی گھات میں رہا۔ اور جب وہ آیا اور لپ بھر بھر کر اناج اٹھانے لگا تو میں نے اس کو پکڑا اور کہا کہ میں تمہارا معاملہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ تو اس نے کہا مجھے چھوڑ دو میں بڑا محتاج ہوں۔ میرے اوپر عیال کا بوجھ ہے۔ اب میں نہیں آؤں گا۔ تو میں نے اس پر رحم کیا اور چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابو ہریرہؓ رات تمہارے قیدی کا کیا ماجرا ہوا۔ تو میں نے کہا کہ یا رسول اللہ اس نے اپنی شدید ضرورت بیان کی اور اپنے عیال کی شکایت کی تو مجھے رحم آ گیا اور میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا آگاہ رہو وہ جھوٹا ہے وہ پھر آئے گا۔ میں اس کی گھات میں رہا، جب وہ آیا اور لپ بھر بھر کر اناج اٹھانے لگا تو میں نے اس کو پکڑا اور کہا کہ تمہارا مقدمہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے جاؤں گا۔ یہ آخری بار ہے، تین بار تم یہ حرکت کر چکے، تم دعویٰ کرتے ہو کہ آئندہ ایسا نہیں کرو گے اور پھر کر بیٹھتے ہو۔ اس نے کہا کہ مجھے چھوڑو۔ میں تمہیں کچھ کلمات سکھا دوں گا جس سے اللہ تمہیں نفع دے گا۔ میں نے کہا وہ کیا ہیں تو اس نے کہا تم سونے کا ارادہ کرو تو آیت الکرسی پڑھ لیا کرو۔ اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم سے لے کر اخیر آیت تک۔ ایسا کرو گے تو اللہ کی طرف سے تمہارے اوپر ایک نگران رہے گا اور شیطان تمہارے قریب نہیں آئے گا، یہاں تک کہ صبح ہو جائے۔ تو میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابو ہریرہ رات تمہارے قیدی کا کیا معاملہ رہا۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! اس نے دعویٰ کیا کہ وہ مجھے کچھ کلمات سکھائے گا جس سے اللہ تعالیٰ مجھے نفع دے گا تو میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ آپ نے پوچھا وہ کلمات کیا ہیں۔ میں نے کہا کہ اس نے کہا کہ جب تم لیٹنے لگو تو آیت الکرسی پڑھ لیا کرو، شروع سے لے کر ختم آیت تک اور اس نے یہ کہا کہ اس حالت میں تمہارے اوپر اللہ کی طرف سے ایک نگران مقرر ہو جائے گا اور شیطان قریب نہیں آئے گا، یہاں تک کہ صبح ہو جائے۔ اور یہ سب لوگ اس طریقہ کے خیر کے بڑے حریص تھے۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا آگاہ کہ

اس نے بات تو سچی کہی لیکن وہ جھوٹا ہے۔ ابو ہریرہؓ جانتے ہو یہ کون ہے جس سے تین راتوں سے تم باتیں کر رہے ہو۔ انہوں نے کہا میں نہیں جانتا تو آپ نے فرمایا یہ شیطان ہے۔

وضاحت: باب کے دو حصے ہیں پہلے میں یہ ہے کہ اگر ایک صاحب نے کسی کو وکیل بنایا اور وکیل نے کوئی چیز نظر انداز کر دی تو اب یہ موکل کے اوپر ہے، وہ اگر اس کو جائز قرار دے دے تو جائز ہو جائے گی اور اگر نہیں تو جائز نہیں ہوگی۔ علی ہذا القیاس وکیل صاحب قرض بھی دیں گے تو موکل اگر اجازت دے دیتا ہے تو جائز ہے ورنہ نہیں۔ یہ بھی واضح ہے کہ وہ جائیداد بیچنے کی بھی اجازت دے سکتا ہے۔ ان سب باتوں کا تعلق کامن سنس سے ہے۔

اس کے بعد امام صاحب نے باب کی عبارت میں ایک ہدایت نقل کی ہے۔ یہ روایت ہے تو بہت مشہور لیکن گوناگوں مشکلات سے معمور ہے۔ رمضان کی زکوۃ سے مراد صدقہ فطر ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ فطر پہلے اکٹھا کر لیا جاتا تھا اور اس کی حفاظت پر کسی کو مامور کر دیا جاتا تھا۔

اس روایت میں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ جو واقعہ بیان کرتے ہیں، بعینہ یہی واقعہ الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ پانچ اور جلیل القدر صحابہ بھی بتاتے ہیں اور ابو ہریرہؓ جس پایہ کے ہیں وہ لوگ اس سے بھی زیادہ بلند پایہ کے ہیں۔ یہ سب لوگ یہ کہتے ہیں کہ مجھے حفاظت پر مقرر کیا گیا تھا۔ آپ شرح عینی میں دیکھ لیں وہاں یہ روایتیں موجود ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے اس کو اناج لینے دیا۔ پھر اس کی محتاجی اور اہل و عیال کی مصیبت کا حال سن کر اس کو چھوڑ دیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یتامی اور فقرا و مساکین کا جو مال ان کی امانت میں رکھا گیا تھا اس میں وہ یہ تصرف کر سکتے تھے اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ تین مرتبہ انہوں نے ایسا کیا۔ تیسری مرتبہ تو ان کا اپنا مقصد بھی تھا۔ جب اس نے وظیفہ سکھانے کا وعدہ کیا اور بتایا کہ آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرو تو انہوں نے اس کو اناج لے جانے دیا۔ یہ بات کسی طرح جائز نہیں ہو سکتی اس لیے کہ مال یتامی اور غرباء کا حق تھا۔

اس روایت کی تیسری مشکل یہ ہے کہ اس میں صاف بتایا گیا ہے کہ یہ شیطان تھا۔ دوسری روایات میں یہ بھی ہے کہ یہ خبیث جنات میں سے تھا۔ سوال یہ ہے کہ ایک خبیث شیطان کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ آیت الکرسی میں فلاں رمز ہے۔ قرآن مجید سے تو یہ بات نہیں معلوم ہوتی۔ اگرچہ آیت الکرسی قرآن مجید میں ہے۔ اگر یہ بات کسی کو معلوم ہو سکتی تھی تو آنحضرت ﷺ کو معلوم ہو سکتی تھی۔ اگر حضور ﷺ بتاتے تو معلوم ہو جاتا کہ آیت الکرسی میں یہ راز ہے۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں آیت الکرسی کے بارے میں کوئی

اعتراض کر رہا ہوں۔ میرا اپنا عمل یہ ہے کہ معلوم نہیں کب سے رات سونے سے پہلے میں آیت الکرسی پڑھتا ہوں، پھر سورہ اخلاص اور معوذتین اور اس کے بعد سونے کی دعا پڑھتا ہوں۔ پھر اردو میں دعائیں مانگتا ہوں۔ میں نے حافظہ پر بہت زور دیا لیکن یاد نہیں آیا کہ کب سے یہ عمل ہے اور کہاں سے میں نے یہ اختیار کیا ہے۔ اس روایت کے اوپر تو میں اعتماد نہیں کر سکتا اس لیے کہ یہ روایت اصول حدیث کی رو سے گویا آنحضرت ﷺ کی تصویب ہے لیکن بات تو شیطان کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ شیطان پر اس بات کا القاء کہاں سے ہوا۔ یہ مسئلہ قابل غور اس لیے ہے کہ وہ بعض باتیں اچک تو سکتا ہے لیکن آسمانی وحی سے اچک نہیں سکتا تھا۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں شیاطین اور جنات پر قدغن عاید کر دی گئی تھی۔ اگر آنحضرت ﷺ یہ بات فرماتے تو شیطان اچک سکتا تھا لیکن اس صورت میں صحابہ کرام خود بھی اس بات کے راوی ہوتے جب کہ ابو ہریرہؓ جیسے کثیر الروایہ شخص کو بھی یہ بات شیطان کی زبان سے معلوم ہوئی۔

ایک اور بھی مسئلہ ہے جو بڑا پیچیدہ ہے۔ وہ یہ کہ یہ قطعی طے ہے کہ وہ شیطان تھا۔ دوسری روایات میں ہے بھی کہ بڑے خطرناک جنات میں سے تھا۔ تو کیا شیطان کو اتنا تصرف ہے کہ وہ سرکاری خزانے پر تاخت کر سکے۔ اگر ایسا ہے تو امان ہی اٹھ جاتی ہے۔ راتوں رات یہ خزانے خالی ہو جائیں گے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو اجازت تو ملی ہے لیکن یہ اجازت مقید ہے۔ اجازت اس بات کی ہے کہ وہ وسوسہ اندازی کر سکتا ہے، اس سے زیادہ کا اس کو اختیار نہیں ہے۔ سورۃ الناس شیطان کے بارے میں سب سے جامع سورہ ہے۔ اس میں یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ صرف وسوسہ اندازی کر سکتا ہے۔ اس لیے وہ تمام روایات جس میں آتا ہے کہ وہ کسی کو پاگل بنا سکتا ہے، کسی کو مخبط کر سکتا ہے، تو یہ سب روایات قرآن کے خلاف ہیں۔ اس کو وسوسے سے زیادہ کچھ دخل نہیں۔

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ شیطان نہیں تھا بلکہ شیطان نما انسان تھا۔ اس تاویل پر میں نے بھی بہت غور کیا لیکن روایات میں بڑی وضاحت سے ہے کہ وہ جنات میں سے تھا۔ اور اس کی شکل بھی بعض روایات میں بیان ہوئی ہے۔ ان میں یہ ہے کہ جب اسے کہا گیا کہ اپنی شکل دکھاؤ تو اس نے پہلے ہاتھ دکھائے جو خنزیر کی طرح دکھائی دیے۔ اگر وہ انسانوں میں سے بھی مان لیا جائے تب بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ بہر حال اس روایت میں بے شمار مجہول ہیں جن کا حل نہیں ملتا۔

(ترتیب: سید اسحاق علی)

امین احسن اصلاحی

درس موطا امام مالکؒ

(کتاب الطہارۃ کی روایات)

(۲) باب وضوء النائم اذا قام الی الصلاۃ

باب: نماز کے لیے سو کر اٹھنے والے کے وضو کا بیان

۶۔ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِکٍ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِذَا اسْتَیْقَظَ اَحَدُکُمْ مِنْ نَوْمِهٖ فَلْیَغْسِلْ یَدَهٗ قَبْلَ اَنْ یُدْخِلَهَا فِیْ وَضُوْئِهٖ. فَاِنَّ اَحَدَکُمْ لَا یَدْرِیْ اَیْنَ بَاتَتْ یَدُهٗ.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی نیند سے سو کر اٹھے تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنا ہاتھ دھوئے قبل اس کے کہ اس کو اپنے وضو کے پانی میں داخل کرے۔ کیونکہ تم میں سے یہ کسی کو پتا نہیں ہوتا کہ اس کے ہاتھ نے کہاں رات بسر کی ہے۔

وضاحت: لوگ کھلے برتنوں جیسے لگن وغیرہ میں پانی لے کر وضو کرتے تھے۔ بہت سے علاقوں میں یہ رواج آج بھی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ وضو کے پانی میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کو اچھی طرح دھو لیا جائے۔ یہ صفائی کے نصب العین کا تقاضا ہے۔ اس میں ضروری نہیں ہے کہ نجاست ہی لاحق ہوئی ہو کہ آپ تلاش کریں کہ کہاں نجاست کا امکان ہو سکتا ہے۔ لوٹا استعمال کرنے کی صورت میں یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

یہاں اس احتیاط کی علت یہ بیان ہوئی ہے کہ سوتے میں آدمی کا ہاتھ ایسی جگہ بھی پڑ جاتا ہے جہاں بہر حال احتیاط کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس کو وضو کے پانی میں یا اپنے منہ میں ڈالنے سے پہلے اطمینان کر لیا جائے کہ اس کو اچھی طرح سے پاک کر لیا گیا ہے۔ یہ احتیاط بہر حال کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں لوگوں نے جو غیر ضروری بحثیں کی ہیں میں ان سے تعرض نہیں کرنا چاہتا۔

۷۔ وَحَدَّثَنِیْ عَنْ مَالِکٍ عَنْ زَیْدِ بْنِ اَسْلَمَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ: اِذَا نَامَ اَحَدُکُمْ مُضْطَجِعًا فَلْیَتَوَضَّأْ.

ترجمہ: زید بن اسلم سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی

لیٹ کر سوئے تو چاہیے کہ وہ وضو کرے۔

وضاحت: بیٹھے بیٹھے نیند کی کیفیت طاری ہونے کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ بیٹھے ہوئے ہیں اور اونگھ آ گئی جس طرح مسجدوں میں اور خاص طور پر جمعہ کی نماز کے انتظار کے دوران میں ہو جاتا ہے۔ اس سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ مسجدوں میں جو لوگ اس طریقہ سے اونگھ کر جھومتے ہیں کہ مظنہ اس بات کا ہوتا ہے کہ کوئی ناقض وضو حالت پیش آ جائے تو اس پر کوئی نکیر نہیں کی جا سکتی۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی چیز کی ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں اور نیند کا غلبہ ہو گیا، یا آپ نیم دراز ہو کر سو گئے، تو وہ نیند ناقض وضو ہو گی اور معمولی نیند سے بھی وضو کرنا پڑے گا۔

۸۔ وَحَدَّثَنِيْ عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ اَنَّ تَفْسِيْرَ هٰذِهِ الْاٰيَةِ: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ (المائدة: ۵۔۶) اَنَّ ذٰلِكَ اِذَا قُمْتُمْ مِنَ الْمَضَاجِعِ يَعْنِي النَّوْمَ.

ترجمہ: زید بن اسلم کہتے ہیں کہ قرآن کی اس آیت کی تفسیر کہ: "اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھوؤ" یہ ہے کہ 'جب تم بستروں سے اٹھو یعنی نیند سے اٹھو۔

وضاحت: حضرت زید بن اسلم کا کہنا یہ ہے کہ آیت وضو میں اذا قمتم الی الصلوۃ کے معنی یہ ہیں کہ جب تم سو کر اٹھو اور نماز پڑھنا چاہو۔ میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ آیت وضو کی اس تفسیر سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ میں اپنا نقطہ نظر تدبر قرآن میں سورہ مائدہ آیت ۹ کے تحت بیان کر چکا ہوں، اسے ملاحظہ فرما لیجیے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ اس آیت کے الفاظ اور سیاق و سباق میں اس تفسیر کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ محض ایک تکلف ہے۔

۹۔ وَحَدَّثَنِيْ عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يَنَامُ جَالِسًا ثُمَّ يُصَلِّيْ وَلَا يَتَوَضَّأُ.

ترجمہ: نافع سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیٹھے بیٹھے سو جاتے تھے تو نماز پڑھ لیتے اور وضو نہیں کرتے تھے۔

وضاحت: اس روایت سے معلوم ہوا کہ غیر ارادی اور اونگھ کی نوعیت کی نیند ناقض وضو نہیں ہے اور نہ اس سے تجدید وضو لازم آتی ہے۔ یہ بات حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے عمل سے بھی ثابت ہے۔

امام مالک کا فتویٰ:

یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک فتویٰ یہ ہے کہ وضو نہیں کرنا ہوگا نکسیر سے، نہ پچھنے سے اور نہ پیپ سے جو جسم سے بہہ نکلے۔ اور وضو نہیں کرنا ہوگا سوائے حدث کی صورت میں جس کا اخراج ذکر سے یا دبر سے یا نیند سے ہو۔

وضاحت: امام مالک کے نزدیک نکسیر کا پھوٹنا، پچھنے لگوانا اور جسم کے کسی حصہ سے پیپ کا اخراج ناقض وضو نہیں ہے۔ وہ صرف تین شکلوں کو ناقض وضو مانتے ہیں جن میں وضو کی تجدید ضروری ہے۔

۱۔ پیشاب کے راستے کسی غلاظت کا اخراج ۲۔ پاخانہ کے راستے کسی غلاظت کا اخراج اور

۳۔ نیند۔ ان صورتوں کے علاوہ وہ کسی امر کو ناقض وضو نہیں مانتے۔

احناف کے نزدیک بدن سے خون یا پیپ کے اخراج سے بھی وضو لازم ہوگا۔

(۳) باب الطهور للوضوء

باب: وضو کے پانی کی پاکی کا بیان

۱۰۔ وَحَدَّثَنِيْ يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ سَلَمَةَ مِنْ اٰلِ بَنِي الْاَزْرَقِ عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ اَبِيْ بُرْدَةَ ـــ وَهُوَ مِنْ بَنِيْ عَبْدِ الدَّارِ. اَنَّهُ سَمِعَ اَبَا هُرَيْرَةَ يَقُوْلُ: جَاءَ رَجُلٌ" اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّا نَرْكَبُ الْبَحْرَ وَ نَحْمِلُ مَعَنَا الْقَلِيْلَ مِنَ الْمَاءِ فَاِنْ تَوَضَّأْنَا بِهٖ عَطِشْنَا اَفَنَتَوَضَّأُ بِهٖ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: هُوَ الطَّهُوْرُ مَاؤُهُ، اَلْحِلُّ مَيْتَتُهُ'.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے کہا یا رسول اللہ! ہم سمندر کا سفر کرتے ہیں اور اپنے ساتھ پینے کا پانی تھوڑا سا لیتے ہیں۔ اگر ہم اس سے وضو بھی کریں تو پیاسے رہیں گے تو کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر لیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! اس کا پانی پاک اور اس کا مردار حلال ہے۔

وضاحت: نَرْكَبُ الْبَحْرَ، یعنی ہم سمندری سفر کرتے ہیں۔ اَلْمَاءُ سے مراد (کھاری پانی کے مقابلے میں) شیریں پانی ہے جو سمندری سفر میں پینے کے لیے رکھ لیا جاتا ہے۔ اَلْحِلُّ: حلال، طیب۔

اس روایت میں نبی ﷺ نے دو امور کی وضاحت فرمائی ہے۔ پہلا یہ کہ سمندری پانی پاکیزہ

ہے اور اس کو وضو کے پانی کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا یہ کہ سمندر کا مردار حلال ہے۔ یعنی یہ کہ اس کا مردار بالبداہت حرام نہیں ہے۔ اس رعایت میں اصولی حلت وحرمت فیصلہ کن رہے گی۔ جس طرح سے خشکی کے جانوروں اور فضا کے پرندوں میں سباع (درندے) یا نجس (ناپاک) کا لحاظ رکھا جائے گا اسی طرح دریائی جانوروں میں بھی اس کا لحاظ ضروری ہوگا۔ یہ بات معلوم ہے کہ ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو سباع کے حکم میں ہیں اور بعض ایسی بھی ہیں جو نجس کے حکم میں ہیں۔ یعنی کھانے کی چیزیں الگ ہیں اور نہ کھائی جا سکنے والی چیزیں الگ۔

اس معاملہ میں واقعہ یہ ہے کہ حلت وحرمت کے تعین میں ایسی حد بندی ناممکن ہے کہ اختلاف نہ ہو۔ اختلاف تو ہوگا، تشدد نہیں کرنا چاہیے، رعایت برتنی چاہیے۔ شوافع کے ہاں اس معاملے میں بڑی ڈھیل ہے۔ ہر فقہ پر علاقے کا اثر ہے۔ یہ علاقائی اثر فقہ شافعی پر بھی نمایاں ہے۔ ان کے ہاں غیر متشددانہ طرز فکر کی وجہ سے اس فقہ کو سمندری ساحلوں کے قرب وجوار کی قوموں میں خوب فروغ حاصل ہوا ہے۔ اگر آپ ان علاقوں میں جائیں جو سمندروں کے کنارے ہیں تو آپ کو بہت سی چیزوں میں تردد ہوگا کہ یہ لوگ کیکڑا بھی کھاتے ہیں اور کچھوا بھی کھا جاتے ہیں! احناف اس معاملے میں کچھ زیادہ محتاط ہیں۔

ایک بات یاد رہے کہ کھاری پانی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں چیزیں گلتی سڑتی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سمندروں کا پانی اگر کھاری رکھا ہے تو اس میں یہ بھی ایک بہت بڑی حکمت ہے کہ گوشت خراب نہیں ہوتا۔ پس آنحضرت ﷺ کے ارشاد اَلْحِلُّ مَيْتَتُهٗ (اس کا مردار حلال ہے) کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر سمندری مردار حلال ہے بلکہ حلت وحرمت کے اصولوں کے تحت صرف حلال جانور ہی حلال ہے، خواہ وہ زندہ حالت میں پکڑا جائے یا مردہ حالت میں۔ بہرحال سمندر کی وہ چیزیں جو کھانے کی ہیں فقہا کے اختلاف کے لحاظ سے وہی کھانے کی رہیں گی۔ اس معاملے میں جہاں زیادہ تشدد سے اجتناب کرنا چاہیے، وہیں زیادہ نزاکت بھی نہیں پیدا کرنی چاہیے۔ اگر جھینگا کھا سکتے ہیں تو کیکڑے کے اچار میں کیا حرج ہے! وہ بھی کھا لیجیے، کوئی فرق نہیں پیدا ہوگا۔ اور اگر نہ کھائیے تو آنحضرت ﷺ کا جو مسلک گوہ کے متعلق ہے کہ آپ نے فرمایا کہ نہ ہم اس کو کھاتے ہیں اور نہ اس کو حرام کرتے ہیں۔ یہ چیز ہمارے دیار میں نہیں کھائی جاتی ہے، تو معاملہ کو اس پر قیاس کر لیجیے۔

۱۱۔ وَحَدَّثَنِيْ عَنْ مَالِكٍ عَنْ اِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِيْ طَلْحَةَ عَنْ حُمَيْدَةَ بِنْتِ اَبِيْ عُبَيْدَةَ بْنِ فَرْوَةَ عَنْ خَالَتِهَا كَبْشَةَ بِنْتِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ. وَكَانَتْ تَحْتَ ابْنِ اَبِيْ قَتَادَةَ الْاَنْصَارِيِّ. اَنَّهَا اَخْبَرَتْهَا: اَنَّ اَبَا قَتَادَةَ دَخَلَ عَلَيْهَا فَسَكَبَتْ لَهٗ وَضُوْءًا. فَجَاءَتْ هِرَّةٌ لِتَشْرَبَ مِنْهُ.

فَاَصْغٰى لَهَا الْاِنَاءَ حَتّٰى شَرِبَتْ. قَالَتْ كَبْشَةُ: فَرَاٰنِيْ اَنْظُرُ اِلَيْهِ. فَقَالَ: اَتَعْجَبِيْنَ يَا ابْنَةَ اَخِيْ؟ قَالَتْ: فَقُلْتُ: نَعَمْ. فَقَالَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّهَا لَيْسَتْ بِنَجَسٍ. اِنَّمَا هِيَ مِنَ الطَّوَّافِيْنَ عَلَيْكُمْ اَوِ الطَّوَّافَاتِ.

ترجمہ: کبشہ بنت کعب بن مالک سے روایت ہے کہ ابوقتادہ ایک دن ان کے پاس آئے تو انہوں نے ان کے لیے وضو کا پانی ڈالا۔ پھر ایک بلی آ گئی کہ اس میں سے پیے۔ تو انہوں نے اس کے لیے برتن جھکا دیا کہ وہ پی لے یہاں تک کہ اس نے پی لیا۔ کبشہ کہتی ہیں کہ ابوقتادہ نے مجھے دیکھا کہ میں تعجب سے انہیں دیکھ رہی ہوں۔ تو انہوں نے کہا: بھتیجی! کیا تم اس بات پر تعجب کر رہی ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بلی نجس نہیں ہے۔ یہ تو تمہارے اندر گردش رکھنے والوں اور گردش رکھنے والیوں میں سے ہے (یعنی ایسے جانوروں میں سے ہے جو تمہارے گھروں میں آمد و رفت رکھتے ہیں)۔

وضاحت: اَنْظُرُ اِلَيْهِ ; نَظَرَ اِلٰى یعنی تعجب سے دیکھنا۔

مِنَ الطَّوَّافِيْنَ عَلَيْكُمْ اَوِ الطَّوَّافَاتِ۔ یہ راوی کا اشتباہ ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے الطوافین فرمایا یا الطوافات۔ مالکیہ چونکہ آنحضرت ﷺ کے معاملے میں احتیاط برتتے ہیں تو اگر راوی کو شبہ ہوتا ہو تو اس کو روایت میں ضرور ظاہر کر دیتے ہیں اگر یہ بات نہ ہوتی تو عربیت کے لحاظ سے مـن الطـوّافـين والطوّافات آنا چاہیے تھا۔ اَوْ نہیں آنا چاہیے تھا۔ اسی طرح اگر مقصد یہ ہوتا کہ یہ تمہارے لیے تمہارے اندر آمد و شد رکھنے والے جانوروں میں سے ہے تو اس کے لیے من الطوافین کافی تھا اَوْ کی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ یہ راوی کا شبہ ہے۔ حضور ﷺ کی یہ بات دوسری جگہ من الطوافین علیکم والطوافات کے الفاظ میں نقل ہوئی ہے۔

۱۲۔ وَحَدَّثَنِيْ عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ الْحَارِثِ التَّيْمِيِّ عَنْ يَحْيَى بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ حَاطِبٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ خَرَجَ فِيْ رَكْبٍ فِيْهِمْ عَمْرُو بْنُ الْعَاصِ. حَتّٰى وَرَدُوْا حَوْضًا. فَقَالَ عَمْرُو بْنُ الْعَاصِ لِصَاحِبِ الْحَوْضِ: يَا صَاحِبَ الْحَوْضِ! هَلْ تَرِدُ حَوْضَكَ السِّبَاعُ؟ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: يَا صَاحِبَ الْحَوْضِ! لَا تُخْبِرْنَا فَاِنَّا نَرِدُ عَلَى السِّبَاعِ وَتَرِدُ عَلَيْنَا.

ترجمہ: یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن حاطب سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ چند سواروں کے قافلے کے ساتھ نکلے، جن میں عمرو بن عاصؓ بھی تھے، یہاں تک کہ ایک حوض پر اترے۔

حضرت عمرو بن العاص نے صاحب حوض سے پوچھا کہ کیوں بھائی! آپ کے اس حوض پر پانی پینے کے لیے کیا درندے بھی آتے ہیں تو حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ اے حوض والے، ہمیں یہ مت بتائیو کیونکہ ہم ان درندوں کے حوض پر اترتے ہیں اور وہ ہمارے حوض پر اترتے ہیں!۔

وضاحت: **حوضا**۔ حوض، گڑھا جو دیہاتوں میں کھلی جگہوں پر بنا دیتے ہیں جس میں برسات وغیرہ کا پانی جمع ہو جاتا ہے۔ اس پانی کو ضرورت کے وقت لوگ بھی استعمال میں لاتے ہیں اور ان کے جانور بھی پی لیتے ہیں اور نہا بھی لیتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی ہے کہ جانور جب پانی پیتا ہے تو پیشاب بھی کر دیتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ جتنا پیتا ہے اتنا واپس بھی کر دیتا ہے۔ اس طرح کی قباحتیں بھی ہیں۔ ایسے حوضوں کو ٹیوب ویلوں سے سیراب ہونے والے سائنٹفک حوضوں پر قیاس نہ کیجئے گا۔

فَاِنَّا نَرِدُ عَلَى السِّبَاعِ وَ تَرِدُ عَلَيْنَا (ہم ان درندوں کے حوض پر اترتے ہیں اور وہ ہمارے حوض پر اترتے ہیں)۔ اس جملے کی فقاہت ملاحظہ کیجئے۔ کتنا پر حکمت بیان ہے۔ میں حیران ہوں کہ صحابہؓ نے قرآن مجید کے سوا کیا پڑھا ہے! حضرت ابوبکرؓ ہیں کہ مجال نہیں ہے کہ ان کا تیر ذرا بھی خطا ہو۔ وہ اتنے سلیم ہیں کہ ان کے سامنے بعض اوقات سیدنا عمرؓ بھی لاجواب ہو جاتے ہیں۔ پھر حضرت عمرؓ ہیں واقعہ یہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ عقل ان کے قدم چومتی ہے۔ کیا علم ہے! کیا بصارت ہے! اور کیا بصیرت ہے!!! آخر انہوں نے کیا چیز پڑھی ہے! ان کو سارا قانون معلوم ہے، سارا فلسفہ معلوم ہے، سارا اخلاق معلوم ہے، ہر چیز معلوم ہے!

جمع کا مطلب یہ ہے ہمارا اور ان وحشی جانوروں کا پانی پینے کا حوض بعض صورتوں میں مشترک بن جاتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ انہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے کوئی گڑھا چھوڑا ہو تو اس میں سے ہم بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ یہ ان کا ہمارا معاملہ ہے۔ یعنی طوافین اور طوافات کی ایک اور شکل۔۔۔ بیابان اور جنگل میں۔۔۔ بن گئی۔ گویا گھروں میں بھی اور گھروں سے باہر بھی بعض جانور طوافین اور طوافات میں شامل ہیں۔ ان چیزوں کی تحقیق نہیں کی جائے گی۔ ورنہ اس قسم کے شبہات میں پڑ کر زندگی مشکل ہو جائے گی۔

ایک سوال اس بارے میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ پانی کی آخر کیا مقدار ہو گی کہ جس مقدار پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ پانی پاک نہیں ہے۔ یہ بات عقل سے صاف معلوم ہوتی ہے کہ اگر پانی تھوڑا ہے تو معمولی نجاست سے بھی ناپاک ہو جائے گا۔ لیکن پانی اگر زیادہ ہو تو اس کو ناپاک نہیں ہونا چاہیے۔ یہ عقل کا تقاضا ہے۔ یہ بات بھی عقل سے معلوم ہوتی ہے اور فقہاء نے اس کو مانا بھی ہے کہ اگر پانی کا رنگ بدل جائے، اس کی بو بدل جائے اور اس کا ذائقہ بدل جائے تو بہرحال وہ پانی ناپاک ہے۔ اس کو ناپاک ہونا چاہیے،

طبعاً اس سے نفرت ہوتی ہے۔ لیکن پانی کتنا زیادہ ہو کہ جس کو یہ کہا جائے کہ جس میں نجاست کی کوئی بھی مقدار ملے جو رنگ، بو اور ذائقے کو تبدیل نہ کر دے تو وہ پاک ہی رہے گا۔ تو ہمارے فقہاء نے اس معاملے میں بھی وضاحت کی ہے۔ ایک تو مشہور حدیث قلتین ہے جس کے الفاظ یوں ہیں:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ يُسْئَلُ عَنِ الْمَاءِ يَكُوْنُ فِي الْفَلَاةِ مِنَ الْاَرْضِ وَمَا يَنُوْبُهُ مِنَ السِّبَاعِ وَالدَّوَابِّ. قَالَ: فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِذَا كَانَ الْمَاءُ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحْمِلِ الْخَبَثَ

(سنن الترمذی: کتاب الطہارۃ باب ۵۰)

﴿حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سنا جب کہ رسول اللہ ﷺ سے ویرانے میں پائے جانے والے پانی کے متعلق سوال کیا گیا تھا کہ جس پر درندے اور چوپائے آمد و شد رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اس پانی کی مقدار دو مٹکوں کے برابر ہو تو اس میں ناپاکی کا احتمال نہیں ہو گا۔﴾

قُلّۃ مٹکے کو کہتے ہیں۔ مٹکا کتنا بھی بڑا ہو بہرحال مٹکا ہی ہو گا۔ یعنی کوئی دو ڈھائی مشک (عام سائز کی) پانی آ جائے گا۔ گویا پانچ مشک کے بقدر پانی نجس نہیں ہو گا۔

شوافع کا عمل حدیث قلتین پر ہے۔ البتہ احناف کا مسلک یہ ہے کہ اگر گڑھے کا سائز عشر فی عشر (یعنی دس ہاتھ چوڑا اور دس ہاتھ لمبا ہو) تو اس کے بقدر جب پانی ہو گا تو وہ ناپاک نہیں ہو گا۔ اس میں چاہے جتنی بھی نجاست ملتی رہے اگر اس کا رنگ، بو اور ذائقہ تبدیل نہیں ہوا تو وہ پاک تصور ہو گا۔ دوسرے ان کا کہنا ہے کہ اگر اس گڑھے میں ایک کنارے سے حرکت دی جائے تو دوسرے کنارے پر لہر نہ پیدا ہو۔ لیکن یہ بات قرین عقل نہیں ہے اس لیے کہ حرکت حرکت میں بہرحال فرق ہو گا۔ ان کے نزدیک بھینس اور بکتے سے بھی فرق نہیں پیدا ہو گا۔ یہ بھی کچھ یونہی سی عقلی بات ہے۔

میرے نزدیک حنفیہ کی لگائی ہوئی اس طرح کی قیدوں کی کوئی افادیت نہیں ہے۔ صحیح مسلک اس معاملے میں یہی ہے کہ پانی کی مقدار دو مٹکوں سے کم نہ ہو اور رنگ، بو اور ذائقہ اگر تبدیل نہ ہوا ہو تو پانی پاک ہے۔ حدیث قلتین ان علاقوں کے لیے ہے جن میں پانی کی مقدار بہت کم ہوتی ہے۔ ہاں اس کو جواز کے معنی میں سمجھیے کہ اگر رنگ، بو اور ذائقہ متغیر نہیں ہوا ہے تو اس کے استعمال کی کھلی اجازت ہونی چاہیے۔ پانی کی اہمیت کا اندازہ بہرحال دریاؤں کی سرزمین کے باسی نہیں کر سکتے۔

۱۳۔ وَحَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ أَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ يَقُوْلُ: إِنْ كَانَ الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ فِی زَمَانِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لَيَتَوَضَّؤُوْنَ جَمِيْعًا۔

ترجمہ: نافع سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مرد اور عورتیں وضو کر لیتے تھے سب مل کر۔

وضاحت: جَمِيْعًا۔ سب مل کر سے مراد ہے ایک ہی برتن میں۔

یعنی عہد نبوی میں ایک ہی برتن سے وضو کے لیے مرد اور عورتیں یکساں استفادہ کرتے تھے، یہ اس حدیث کا بنیادی مضمون ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ ایک لگن یا تھال میں پانی رکھا ہے۔ اسی سے مرد اور عورت نے حسب ضرورت وضو کر لیا۔ یا ہاتھ وغیرہ دھونے کی ضرورت پیش آئی تو مرد اور عورت دونوں نے چلو سے ذرا سا پانی لے کر ہاتھ وغیرہ دھو لیے تو یہ کام دونوں کرتے رہے۔ اس معاملے میں کوئی خاص احتیاط نہیں ہے۔

امام مالک کا فتویٰ:

یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ نے فرمایا کہ بلی کے معاملے میں کوئی حرج نہیں ہے الا آنکہ اس کے منہ میں کوئی ناپاک چیز ہو۔

وضاحت: امام مالک کے نزدیک بلی اصلاً طوافین وطوافات کے حکم میں شامل ہے۔ گھروں میں اس کی آمد و شد معمولات کا حصہ ہے۔ البتہ اگر وہ تازہ تازہ چوہے کھا کر آ رہی ہے تو احتیاط مناسب ہے، اس سے بچنا چاہیے۔ یہاں اسی اصولی رخصت پر قیاس کیا جائے گا جو پردے کے احکام کے سلسلے میں گھریلو خدمت گاروں از قبیل غلام، خانگی ملازم اور بچوں کے معاملے میں ہے کہ پابندیاں نرم ہیں۔ یہ اصول خانگی جانوروں کو بھی محیط ہوگا۔

تاہم کتا اس سے مستثنیٰ ہے اس لیے کہ اس کو واضح طور پر نجس قرار دیا گیا ہے۔ بہر حال یہ استثناء ٹھیک ہے۔ بلی اور کتے کے معاملے میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ اگر اہل مغرب کتوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاتے ہیں تو کھلائیں لیکن ہم اس گندگی کو گوارا نہیں کر سکتے۔

بلی یا ایسے جانور جو آمد و شد رکھنے والے تو نہیں ہیں لیکن اگر وہ اچک کر کھا لیتے ہیں تو بہر حال اس سے بقیہ کھانا نجس نہیں ہو جاتا۔

(ترتیب: ماجد خاور)

خالد مسعود

رسول اللہ ﷺ کی شخصیت پر اعتراضات

رسول اللہ ﷺ کی دعوت میں مکہ کے عوام و خواص کی دلچسپی اور اس سے مرعوبیت کو دیکھتے ہوئے جب قریش کے لیڈروں کو اس دعوت کی کامیابی کے آثار نظر آنے لگے اور ہر گھر میں اس کا چرچا ہونے لگا تو انہوں نے جہاں قرآن کی حیثیت کو مشکوک قرار دینے کی کوشش کی وہیں حضور کے رسول اللہ ہونے کی حیثیت کو بھی مشتبہ ثابت کرنے کی سعی کی اور ایسے ایسے نکات پیش کیے جن سے عوام کو حضور کے خلاف کیا جا سکے۔ یہ حملہ کئی جہتوں سے ہوا۔

بشریت کا طعنہ:

نبی ﷺ قریش کے خانوادہ بنی ہاشم میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شجرۂ نسب معلوم و معروف تھا۔ آپ کی پرورش اہل مکہ کی نظروں کے سامنے ہوئی۔ آپ نے تجارت کو ذریعہ معاش بنایا۔ مکہ کے تاجروں کے ساتھ آپ کی شراکتیں رہیں اور آپ نے ایک سچے اور امانت دار تاجر کے طور پر نام پیدا کیا۔ آپ نے قریش ہی کے ایک خانوادہ میں شادی کی اور آپ کے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کی تمام ضرورتیں وہی تھیں جو معاشرہ کے ہر فرد کی ہوتی ہیں۔ آپ کو دوسرے انسانوں کی طرح زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ جن مسائل سے آپ دوچار ہوئے وہ وہی مسائل تھے جو عام انسانوں کو پریشان رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے آپ کی زندگی دوسرے لوگوں سے کسی طرح مختلف نہ تھی۔ لہٰذا قریش کے پاس یہ پروپیگنڈا کرنے کا پورا موقع موجود تھا کہ محمد (ﷺ) تمام بشری خصوصیات رکھتے ہیں۔ یہ ہماری طرح کھاتے پیتے ہیں۔ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے ان کو بازاروں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ یہ بیوی بچوں کے مسائل سے بالکل ہماری طرح دوچار رہتے ہیں۔ ان کو بیماری اور موت کے مراحل سے بھی دوسرے انسانوں کی طرح گزرنا ہے۔ پھر یہ کس برتے پر خدا کا نمائندہ ہونے کے دعویدار ہیں۔ یہ ہماری مانند صرف ایک بشر ہیں اور نبی و رسول ہونے کا ان کا دعویٰ بالکل بے حقیقت ہے۔

ظاہر ہے کہ محض اس پروپگنڈے سے قریش کی بات ذہین لوگوں کے دلوں میں جگہ نہ پا سکتی تھی۔ وہ دعوائے رسالت کی صداقت کا اطمینان کرنے کے لیے مزید سوالات کرتے تو قریش کے اکابر کو اپنی بات منوانے کے لیے کئی کئی توجیہات کرنا پڑتیں۔ وہ کہتے کہ محمد کو بطور رکن خاندان اور تاجرانہ کامیابی

حاصل نہیں ہوئی کہ ان کا شمار سادات قریش میں ہوتا اس لیے انہوں نے دوسروں پر فوقیت حاصل کرنے کی غرض سے ایک ایسا دعوی کر دیا ہے جس کی صداقت کو جانچنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اگر ہم اس دعوی سے مرعوب ہو کر اپنے ہی جیسے ایک بشر کو خدا کا نمائندہ سمجھ کر سر پر بٹھالیں گے تو بلاوجہ اس کے مطیع ہو کر نقصان اٹھائیں گے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے دعوائے نبوت کو قریش کے خانوادوں کی باہمی چپقلش کے تناظر میں بھی دیکھا اور بنوامیہ کے ایک لیڈر نے یہ کہا کہ ہم نے بنو ہاشم کا مقابلہ ہر میدان میں کیا اور ان سے باہر نہ مانی۔ اب ان کے ایک فرد نے نبوت کا دعوی کر کے ہم پر اپنی فضیلت جتانے کا ارادہ کیا ہے تو کیا ہم ان کے غلام بن کر رہ جائیں!

کبھی قریش عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے اس حقیقت کا انکار کر دیتے کہ اللہ تعالی کسی بشر پر کوئی وحی نازل کر سکتا ہے (انعام: ۹۱) وہ کہتے کہ اگر محمد پر فرشتے اتر سکتے ہیں تو آخر ہم پر کیوں نہیں اتر سکتے؟ اگر یہ شخص اپنے دعوی میں سچا ہے تو ہم بھی توقع رکھتے ہیں کہ ہمیں وہی کچھ ملے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔ اسی طرح کی وحی ہمارے پاس بھی آئے جس طرح کی وحی محمد پر نازل ہوتی ہے۔ اس صورت میں ہمیں کوئی شبہ لاحق نہ ہوگا، ہم وحی پر ایمان لے آئیں گے۔ اس کے بغیر محمد کے دعوائے نبوت کو ہم تسلیم نہیں کر سکتے۔ (انعام: ۱۲۴) کبھی یہ بھی کہتے کہ ایک بشر اللہ کے پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ لازم ہے کہ فرشتے یہ فریضہ سرانجام دیں جو ایک نورانی مخلوق اور اللہ کے مقرب ہیں۔ اگر اللہ کو ہماری تعلیم مطلوب ہوتی تو وہ فرشتوں کو ہماری رہنمائی کے لیے ہمارے درمیان بھیجتا۔ لہذا جب تک یہ انتظام نہیں ہوتا ہم محمد کے دعوی کو محض جھوٹ سمجھتے ہیں۔

مکہ کے عوام جب قریشی لیڈروں سے رسول اللہؐ کی دعوت کے بارے میں سوال کرتے جو لوگوں کو متاثر کر رہی تھی، پھر وہ انبیاء کی تاریخ کے ان واقعات کے بارے میں دریافت کرتے جو قرآن بیان کرتا اور رسولوں کے مکذبین کو ان کے انجام کی خبر دینے کے لیے سناتا تھا تو قریش ان کو تسلی دیتے کہ محمد جو کچھ پیش کر رہے ہیں یہ ان کی من گھڑت باتیں ہیں۔ یہ محض گزشتہ اقوام کے بے اصل قصے اور ماضی کے افسانے ہیں جن کو خدا کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں کسی قدر دخل اہل کتاب کی سازش کو بھی ہے۔ ان میں سے کوئی شخص محمد کو اپنی کتابوں کی معلومات صبح وشام فراہم کرتا ہے اور وہ ان معلومات کو وحی بتا کر پیش کرتے ہیں۔ قریش اسلاف کے ساتھ عوام کی محبت کے جذبہ کو بھی حق کی مخالفت میں بطور حربہ استعمال کرتے۔ وہ کہتے کہ محمد کی تعلیم کا ہمارے بزرگوں کی تعلیم سے کیا مقابلہ ہے۔ اصل علم تو وہی ہے جو ہمارے پاس اسلاف سے منتقل ہو کر آیا ہے (غافر: ۸۳) یہ شخص تمہیں اپنے معبودوں سے برگشتہ کرنا چاہتا

ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے رسول کا روپ دھار لیا ہے۔ لہذا وقت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ محمد سے دور رہیں، اس کی باتوں پر کان نہ دھریں اور اپنے اسلاف کے طور طریقہ اور معبودوں کی پوجا پاٹ پر یکسوئی سے جمے رہیں۔ یہ جو بات کہہ رہا ہے ہم نے اس دور آخر میں تو سنی نہیں۔ یہ محض ایک من گھڑت بات ہے! (ص: ۶-۷) اس خیال کے پھیلانے میں حصہ اگرچہ قریش کے متعدد لیڈروں نے لیا لیکن اس میں پیش پیش ان کے دو سردار ابولہب اور ابوجہل تھے جو حضور کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے۔ آپ جب کسی فرد یا جماعت کو خدا کا پیغام سناتے اور توحید کی تعلیم دیتے تو یہ فوراً آپ کی تقریر کا اثر زائل کرنے کے لیے اسلاف کے حوالے سے لوگوں کو بتاتے کہ یہ شخص ہمارے معزز ومحترم اسلاف کی شان میں گستاخی کرتا اور ان کو حق سے منحرف سمجھتا ہے۔ اس لیے اس کی بات کو اہمیت نہ دو۔ ابولہب کی یہ منادی تاریخ کے اوراق میں ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے:

> ''اے بنو فلاں! یہ شخص چاہتا ہے کہ تم لات وعزی سے برگشتہ ہو کر اور بنو مالک بن اقیش کے جنوں میں سے اپنے حلیفوں سے قطع تعلق کر کے اس کی لائی ہوئی بدعت و ضلالت کو قبول کر لو۔ پس تم نہ اس کی بات سننا، نہ اس کو قبول کرنا''۔

ان لوگوں نے اپنے غنڈہ عناصر کو بھی سکھا رکھا تھا کہ جب محمد لوگوں کو اپنی بات سنا رہے ہوں تو شور کر کے اور ہڑبونگ مچا کر اس بات کو ناممکن بنا دیا کرو کہ وہ اپنی بات پورے سکون کے ساتھ کسی کو سمجھا سکیں۔ وہ عوام کو اپنے موقف کے صحیح ہونے کی تسلی دیتے ہوئے کہتے کہ ہم جن معبودوں کو پوجتے اور ان کے نام پر جن چیزوں کو حلال وحرام ٹھہراتے ہیں یہ سب خدا ہی کی مرضی سے کرتے ہیں۔ اگر یہ کام غلط ہوتے تو خدا ان کو کیسے گوارا کرتا۔ وہ لازماً اپنی قدرت سے ہمیں ان سے روک دیتا۔ قیامت کے تصور کو وہ محض ایک ڈراوا قرار دیتے اور کہتے کہ جب ہم مر کر مٹی اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو اس کے بعد دوبارہ زندگی پانے اور اٹھائے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ محمد یہ تصور محض اپنے پیروؤں کی تعداد بڑھانے کے لیے پیش کر رہے ہیں۔

قریش کا نبی ﷺ کی بشریت پر معترض ہونا بالکل نارو ا تھا۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام عربوں کے جد امجد تھے۔ قریش ان کے شجرہ نسب کو جانتے اور اپنا شجرہ نسب ان تک پہنچانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ دونوں بزرگ شخصیتیں نبوت کے منصب پر فائز تھیں اور انہی کا بتایا ہوا دین تھا کہ جس کے بقایا قریش کو عزیز اور ان کی سیادت کا ایک سبب تھے۔ لہذا قریش سے یہ بات مخفی نہیں تھی کہ خدا کے پیغمبر بشر ہی ہوتے ہیں، وہ دوسرے لوگوں کی طرح کھاتے پیتے، شادی بیاہ کرتے، بیوی بچوں میں رہتے اور زندگی کے ان مشاغل میں حصہ لیتے ہیں جن میں دوسرے لوگ حصہ

لیتے ہیں۔ قریش انبیائے بنی اسرائیل کے بارے میں بھی معلومات رکھتے تھے کہ یہ سب بشر تھے۔ ان میں سے کوئی فرشتہ نہ تھا۔ لہذا بشریت پیغمبری میں بھی مانع نہیں ہوتی۔

انبیاء کا تعلق کسی دوسری مخلوق سے ہونا البتہ ناقابل فہم تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کی تعلیم و اصلاح کے لیے ایک انسان ہی موزوں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کے جذبات و احساسات، عواطف و ضروریات اور عمومی صلاحیتیں انہی جیسی ہوتیں ورنہ وہ انسانوں کو نہ ان کے اپنے انداز میں کوئی بات سمجھا سکتا نہ عمل میں ان کے لیے نمونہ پیش کر سکتا۔ ہاں اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے اور ان کی تعلیم مقصود ہوتی تب اللہ تعالیٰ یقیناً فرشتہ ہی کو نبی بناتا کیونکہ وہی اس کام کے لیے موزوں ترین ہوتا۔ اسی بات کو قرآن نے واضح کرتے ہوئے فرمایا:

''لوگوں کے پاس جب ہدایت آگئی تو اس پر ان کے ایمان لانے میں اس کے سوا
کوئی رکاوٹ نہیں بنی کہ انہوں نے یہ کہا کہ اللہ نے ایک بشر کو رسول مبعوث کیا ہے!
تم انہیں بتاؤ کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے اور قیام پذیر ہوتے تو ہم ان پر
آسمان سے کوئی فرشتہ ہی رسول بنا کر اتارتے''۔ (اسراء: ۹۴۔۹۵)

فرشتوں کو فرداً فرداً انسانوں کے پاس بھیجنے کا مطالبہ بھی اس لیے ناروا تھا کہ نبوت کا تاج پہننے کے لیے موزوں شخص وہی ہو سکتا ہے جو معاشرے کا صالح ترین انسان، سلامتی طبع اور صفائی قلب کا اعلیٰ نمونہ اور بلند اخلاق و کردار کا عمدہ پیکر ہو۔ ایسا شخص اپنی فطرت کے لحاظ سے وحی کا نور اپنے اندر سمو لینے پر قادر ہوتا ہے جب کہ دنیاداری میں لتھڑے ہوئے لوگ اس لائق نہیں ہوتے کہ وہ فرشتۂ وحی سے کچھ اخذ کر سکیں۔ اسی لیے قرآن نے قریش کے مطالبہ کا یہ جواب دیا کہ ''اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت کی ذمہ داری کس کو سونپے''۔ (انعام: ۱۲۴)

قریش کے اس مطالبہ کے جواب میں کہ آخر فرشتے ہم پر کیوں نہیں اترتے، قرآن نے جہاں یہ وضاحت کی کہ ہر شخص اس کا اہل نہیں کہ اللہ اس کو نبوت کے مقصد کے لیے منتخب کر لے، وہیں ایک مسکت جواب یہ بھی دیا کہ فرشتے کا نزول دوسرے لوگوں پر بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ بندوں کے لیے بے حد خطرناک ہوتا ہے، کیونکہ فرشتے کسی مقصد حق کے ساتھ آتے ہیں اور رسولوں کے مکذبین کے معاملہ میں مقصد حق ان کو کیفر کردار تک پہنچانا ہوتا ہے جس کی مثال قوم لوط کے عذاب کے لیے فرشتوں کی آمد کا واقعہ ہے۔ فرمایا:

''یہ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پر یاددہانی اتاری گئی ہے، تم تو ایک خبطی ہو۔ اگر تم
سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتے؟ ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر

فیصلہ کے ساتھ اور اس وقت ان کو مہلت نہیں ملے گی۔ یہ یاددہانی ہم ہی نے اتاری
ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔ (حجر: ۶۔۹)

حقیقت یہ ہے کہ بشریت کے اعتراض کا سامنا رسول اللہ ﷺ کی طرح آپ سے پہلے آنے والے تمام انبیاء و رسل کو کرنا پڑا۔ قریش کا یہ موقف نیا نہیں تھا کہ اللہ نے ان کے پاس ایک بشر کو رسول بنا کر کیوں بھیجا۔ ہر دور کے لوگوں کو یہ اشکال پیش آیا اور انہوں نے نبوت و رسالت کے اعلان کو اپنے اوپر پیغمبر کی برتری حاصل کرنے کی کوشش ہی قرار دیا۔ یہ بات قرآن کے حسب ذیل بیان سے واضح ہے:

''اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو اس نے دعوت دی کہ
اے میری قوم کے لوگو! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، تو کیا
تم (اس کے غضب سے) ڈرتے نہیں؟ تو اس کی قوم کے سرداروں نے، جنہوں
نے کفر کیا، کہا کہ یہ تو بس تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہے۔ یہ تم پر اپنی برتری جتانا
چاہتا ہے۔ اور اگر اللہ رسول ہی بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو بھیجتا۔ اس طرح کی بات
ہم نے اپنے اگلے بزرگوں میں تو سنی نہیں''۔ (مومنون: ۲۳۔۲۴)

''پھر ہم نے ان کے بعد دوسرے لوگ اٹھائے اور ان میں بھی ایک رسول انہی میں
سے اس دعوت کے ساتھ بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود
نہیں، تو کیا تم اس سے ڈرتے نہیں؟ اس کی قوم کے سرداروں نے، جنہوں نے کفر
کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا، اور ان کو ہم نے دنیا کی زندگی میں خوشحالی دے رکھی
تھی، کہا کہ یہ تو بس تمہارے ہی مانند ایک بشر ہے۔ وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو
اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ اور اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی بات مان لی تو
تم بڑے ہی گھاٹے میں رہو گے۔ کیا وہ تمہیں اس بات کا ڈراوا دیتا ہے کہ جب تم
مر جاؤ گے اور خاک اور ہڈیاں بن جاؤ گے تو تم پھر نکالے جاؤ گے؟ بہت ہی بعید
اور نہایت ہی مستبعد ہے یہ ڈراوا جو تمہیں سنایا جا رہا ہے''۔ (مومنون: ۳۱۔۳۶)

جہاں تک سابق انبیاء کے واقعات کا تعلق ہے تو یہی بات یہ ہے، اور یہ قریش سے بھی مخفی نہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ ان کے بارے میں از خود کوئی معلومات نہیں رکھتے تھے۔ آپ نے سابق آسمانی صحیفوں میں سے کچھ پڑھا تھا اور نہ لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف تھے۔ اس کے باوجود آپ جو کچھ سناتے وہ پوری صحت کے ساتھ سناتے بلکہ اس میں اگر اہل کتاب نے کوئی گھپلا کیا ہوتا تو اس کی اصلاح بھی شامل

ہوتی، نیز ہر واقعہ کا سبق بھی نمایاں ہوتا۔ گویا واقعات محض بطور قصہ نہ سنائے جاتے بلکہ ان کا اطلاق قریش کے حالات پر کیا جاتا۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کر کے ماضی کے کسی واقعہ کے بارے میں پوچھا گیا تو قرآن میں اس کی پوری وضاحت آ گئی۔ بالفرض حضور کے پاس کوئی تعلیم دینے والا تھا تو اس طرح کے سوالات کا پورا جواب فی الفور آپ نے کیسے فراہم کر دیا۔ ظاہر ہے کہ غیب کی یہ خبریں آپ کو بذریعہ وحی دی جاتی تھیں کیونکہ آپ اللہ کے رسول تھے اور ہر قدم پر اللہ تعالیٰ خود ہی آپ کی رہنمائی فرما رہا تھا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے مدین کے قیام اور کوہ طور کے واقعات، زکریا علیہ السلام کے ہاں بیٹے کی ولادت، مریمؑ کی کفالت کے احوال، یوسف علیہ السلام کی زندگی کی سرگزشت، ذوالقرنین کی فتوحات اور متعدد پیغمبروں کے واقعات قرآن میں مفصل بیان ہوئے۔ یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے حضورؐ کو بتائیں حالانکہ اس سے پہلے یہ آپ کے علم واطلاع سے باہر کی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایسے واقعات کو بیان کرنے کے بعد یہ وضاحت کر دی کہ:

"یہ ماجرا غیب کی باتوں میں سے ہے جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ سے سنا رہے ہیں۔
اس سے پہلے نہ تم ہی اس کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم کے لوگ ہی"۔ (ہود: ۴۹)

اسی طرح اسلاف کی تعلیم، جس پر قریش کو ناز تھا اور جس کے مقابلہ میں وہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کو نظر انداز کیے ہوئے تھے، معلوم تاریخی حقائق کی روشنی میں وہ نہیں تھی جو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے ان کی نسل کو منتقل ہوئی تھی۔ اس میں سب سے بڑی نقب عمرو بن لحی خزرجی نے لگائی جب اس نے خانہ کعبہ میں بت داخل کیے۔ بعد میں بیت اللہ کے منتظمین نے اس شرک کی سرپرستی کی اور بدعات پر مبنی ایک پوری شریعت رائج کر دی۔ بدعات پر مبنی اسی مذہب کے خلاف حضرت ابراہیمؑ کے سچے پیرو حنفاء ہمیشہ احتجاج کرتے رہے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک اپنا وجود باقی رکھا۔ قریش کو نبی ﷺ کی عمومی اخلاقی تعلیم سے عناد نہ تھا، لیکن جب مشرکانہ نظام پر زد پڑتی تو ان کے مفادات آڑے آ جاتے اور وہ حضورؐ کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے۔

اس طرح رسول اللہ ﷺ کی بشریت پر اعتراض کرنے کی قریش کے پاس کوئی واقعی بنیاد نہ تھی۔ اس حوالے سے انہوں نے جو باتیں بنائیں وہ عقل اور حقائق کی روشنی میں بالکل غلط تھیں۔

دنیاوی خوشحالی نہ ملنے کا طعنہ:

قریش یہ بات بھی کہتے کہ اگر خدا نے ایک انسان ہی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا تو یہ کیوں نہ ہوا کہ اس کی دنیاوی حالت میں ایسی تبدیلیاں کر دی جاتیں جو اس کو دوسرے لوگوں سے ممتاز کر دیتیں اور وہ

عرب کے سرداروں کے سامنے بہتر اسباب حیات کے ساتھ گردن تان کر کھڑا ہو سکتا۔ محمد (ﷺ) کو تو خوشحالی تک بھی حاصل نہیں جبکہ مکہ اور طائف دونوں بستیوں کے اشراف میں متعدد لیڈر ایسے ہیں جو معاشی آسودگی اور اپنی بھاری شخصیت کی بنا پر محمد پر فوقیت رکھتے ہیں۔ یہ لیڈر اس لائق تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجتا۔ محمد کے ساتھیوں میں بھی کوئی بڑی شخصیت نہیں۔ کچھ بے سمجھ نوجوان اور لونڈی غلام ان کے گرد جمع ہو گئے ہیں۔ کوئی عاقل وفرزانہ لیڈر ان کے دام میں نہیں پھنسا۔ گویا ان کی تعلیم صرف ان لوگوں کو متاثر کر سکی ہے جن کی ذہنی سطح اونچی نہیں اور جو سچ اور جھوٹ میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہیں۔

قریش کے کچھ مطالبات ایسے تھے جو اسی ذہنی پس منظر کے ساتھ نبی ﷺ کے سامنے پیش کیے جاتے۔ مثلاً یہ کہ آپ اگر فی الواقع خدا کے نمائندہ ہیں تو ہمارے لیے اس سنگلاخ زمین میں پانی کا ایک چشمہ ہی جاری کر دیں۔ یا اپنے لیے ہی ایک نخلستان اور تاکستان حاصل کر لیں جس کے بیچوں بیچ پانی کی نالیاں ہوں جو اس باغ کو سیراب کریں۔ یہ باغ آپ کی خوشحالی کا ذریعہ بنے اور خدا کی نگاہ میں آپ کے معزز و مکرم ہونے کا ثبوت ہو۔ یا قیام کے لیے خدا سونے کا ایک محل بنا دے جو آپ کی امارت اور تفوق کا منہ بولتا ثبوت ہو۔ قریش اس بات کی توقع بھی رکھتے کہ اللہ کے رسول کی حیثیت سے محمد کو کچھ غیر معمولی کام ان کے اطمینان کے لیے کر کے دکھانے چاہئیں۔ مثلاً اس بات کے ثبوت کے لیے کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ اللہ ہی کی جانب سے ہوتا ہے، ایسا کیوں نہیں ہو جاتا کہ جس عذاب کے نازل ہونے کی دھمکی ہمیں دی جا رہی ہے اس کے کچھ ٹکڑے آسمان سے ہم پر گر پڑیں۔ یا خدا اور اس کے فرشتے ہمارے بالمقابل نمودار ہو جائیں۔ یا آپ ہماری نظروں کے سامنے آسمان میں چڑھ جائیں اور وہاں سے وحی لکھوا کر لائیں جس کو ہم خود پڑھ سکیں۔ ان میں سے کوئی ثبوت مہیا ہو جائے تو ہم آپ کو خدا کا سچا پیغمبر مان لیں گے۔ قریش کا خیال یہ تھا کہ جب ہم دنیاوی اسباب و وسائل کے اعتبار سے مسلمانوں سے بہتر ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کی نگاہوں میں بھی ہم ان سے بہتر ہیں۔ اگر ہم خدا کے مبغوض ہوتے تو وہ ہمیں عیش کرنے کے لیے نہ چھوڑ دیتا۔

اسی طرح قریش آنحضرت ﷺ کے پیرووں کو حقیر جانتے اسی لیے ان کے اکابر ان کے برابر بیٹھنے میں اپنی ہتک سمجھتے اور صاف کہہ دیتے کہ ہم آپ کی بات اس وقت سنیں گے جب ان لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دیں۔ روایات میں آتا ہے کہ قریش ان غریب مسلمانوں کا بہت مذاق اڑاتے جو آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے تھے۔ ان کی تذلیل کی جاتی اور حضور کو ان کی رفاقت پر طعنے دیے جاتے۔ یہی وجہ ہے

کہ ایک مرتبہ جب آنحضرت ﷺ بعض قریشی سادات کو اسلام کی دعوت پیش کر رہے تھے، آپ کے نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ آپ سے ملنے کے لیے پہنچ گئے۔ اگرچہ یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے خالہ زاد بھائی اور قریش ہی سے تعلق رکھتے تھے، اس کے باوجود حضور کو اندیشہ ہوا کہ مغرور سادات ان کی اس وقت آمد اور پھٹی حالت کو دیکھ کر آپ کے صحابہ پر زبان طعن دراز کریں گے کہ تم نے اس طرح کے کچھ اندھوں اور غریبوں کو بیوقوف بنا کر اپنے دام میں الجھا رکھا ہے۔ جب تک تم ان لوگوں کو اپنے سے دور نہیں کرتے ہم تمہاری بات سننے کے لیے تیار نہیں۔ اس طرح کی صورت حال میں نبی ﷺ کو پریشانی لاحق ہوتی کہ وہ ایسے خودسر سرداروں کے معاملہ میں کیا رویہ اختیار اور حق تبلیغ کس طرح ادا کریں۔

جب آخرت کے انجام کا بیان ہوتا اور اس میں مکذبین کو ملنے والی سزاؤں کا ذکر ہوتا تو سادات قریش کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ وہ کسی طرح یہ ماننے کو تیار نہ ہوتے کہ پیغمبر کے نادار اور مفلوک الحال ساتھی تو جنت کی نعمتوں اور آسائشوں سے نوازے جائیں گے اور قریش کے کئی پشتوں سے سردار جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ ایسے بیانات پر وہ مشتعل ہو جاتے تو ٹولیاں بنا بنا کر حضور کو آنکھیں دکھاتے تاکہ آپ ان کے طیش وغضب سے مرعوب ہو کر اپنا مشن چھوڑ جائیں۔

نبی ﷺ کے ساتھ مادی لحاظ سے کوئی غیر معمولی امتیازی سلوک نہ ہونے پر اور آپ کے صحابہ کی بے سروسامانی پر قریش کے اعتراضات معقول نہیں کہے جا سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادی لحاظ سے آسودگی یا بے سروسامانی اور اخلاقی و روحانی اعتبار سے ہدایت پانے یا نہ پانے کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ یہ دو مختلف احوال ہیں۔ ایک آدمی معاشی طور پر آسودہ ہے تو یہ بات اس کے اخلاق و کردار کے افضل ہونے کی ضمانت نہیں ہو سکتی بلکہ دیکھا گیا ہے کہ ایسا آدمی کردار کی ایسی خامیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جن میں کم وسائل رکھنے والے لوگ مبتلا نہیں ہوتے۔ ہدایت تو رب کا فضل ہے۔ جو اس کا طالب بنتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضل سے نوازتا ہے۔ اسباب معیشت کی فراوانی ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اللہ کے ہاں یہ کسی کے منظور نظر ہونے کی دلیل نہیں بلکہ قرآن میں اس کا ذکر نہایت حقارت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

> ''اور انہوں نے اعتراض اٹھایا کہ یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ کیا تیرے رب کے فضل کو یہی تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کی معیشت کا سامان تو ہم نے تقسیم کیا ہے اور ایک کے درجے دوسرے پر بلند کیے ہیں تاکہ وہ باہم دگر ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ اور تیرے رب کی رحمت اس سے بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں۔ اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ ایک

> ہی ڈگر پر چل پڑیں گے تو جو لوگ خدائے رحمان کے منکر ہیں ہم ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی چاندی کے، جن پر وہ چڑھتے۔ اور ان کے گھروں کے کواڑ اور ان کے تخت بھی چاندی کے، جن پر وہ ٹیک لگا کر بیٹھتے۔ اور یہ چیزیں سونے کی بھی کر دیتے۔ اور یہ چیزیں تو بس دنیا کی زندگی کی متاع ہیں اور آخرت تیرے رب کے پاس متقیوں کے لیے ہے''۔ (زخرف: ۳۱۔۳۵)

بشریت کے اعتراض کی طرح نبی کے ساتھیوں پر طعنہ زنی بھی ہمیشہ سے کفار کا وطیرہ رہی ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات کے ضمن میں قرآن کا بیان ہے:

> ''اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے ان کو آگاہ کیا کہ میں تمہارے لیے ایک کھلا ڈرانے والا ہو کر آیا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ میں تم پر ایک دردناک عذاب کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ تو اس کی قوم کے ان سربراہوں نے، جنہوں نے کفر کیا، جواب دیا کہ ہم تو تم کو بس اپنے ہی جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں اور ہم تمہاری پیروی کرنے والوں میں انہی کو پاتے ہیں جو ہمارے اندر کے ذلیل لوگ بے سمجھے بوجھے تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ اور ہم تم لوگوں کے لیے اپنے مقابل میں کوئی خاص امتیاز بھی نہیں دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ ہم تم کو بالکل جھوٹا خیال کر رہے ہیں''۔ (ہود: ۲۵۔۲۷)

اس اعتبار سے گویا قریش کا آنحضرت ﷺ کے ساتھ رویہ وہی تھا جو ماضی کے کفار نے ہر زمانہ میں اپنے انبیاء کے ساتھ روا رکھا تھا۔ چنانچہ جب حضورؐ پر اعتراض ہوتا کہ آپ کوئی فوق الفطری خصوصیات کا مظاہرہ کریں تاکہ ہمارا اشکال رفع ہو تو آپ فرماتے ہیں کہ کامل اختیار میرا رب رکھتا ہے۔ میں تو تمہاری مانند ایک بشر ہوں، البتہ مجھے رسالت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ مجھے اگر جانچنا ہے تو میری اس حیثیت کے لحاظ سے جانچو۔ تم مجھے زچ کرنے کے لیے جو نت نئے مطالبات کر رہے ہو مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔

چنانچہ فرمایا:

> ''(اے پیغمبر) تم کہہ دو کہ میں تمہارے سامنے یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، اور نہ میں غیب جانتا، اور نہ تمہارے سامنے یہ دعویٰ کرتا کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے''۔
> (انعام: ۵۰)

شاعر، کاہن، ساحر، مسحور اور مجنون ہونے کا الزام:

کسی آدمی کے اصل منصب سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے ایک کارگر طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے مشن کو کوئی ایسا رنگ دے دیا جائے جو لوگوں کی نگاہوں میں اس کو بے وقعت بنا دے۔ یہ حربہ قریش نے نبی ﷺ کے معاملہ میں استعمال کیا۔ چونکہ آپ کے پاس پیش کرنے کی اصل چیز قرآن تھا جسے آپ لوگوں کو سناتے اور اپنی رسول ہونے کی حیثیت کو نمایاں کرتے، اس۔ لیے سادات قریش نے آپ کو کبھی شاعر و کاہن ہونے کا الزام دیا۔ کبھی یہ کہا کہ یہ شخص جادوگر ہے جو اپنے جادو کے زور سے معاشرہ میں تفریق پیدا کر رہا ہے۔ کبھی کہتے کہ یہ پہلے تو چنگا بھلا تھا، اب معلوم ہوتا ہے کسی نے اس پر جادو کا عمل کر دیا ہے جس کے باعث مخبوط الحواس ہو کر یہ عجیب عجیب باتیں کرتا ہے۔ حضور کو شاعر کہہ کر وہ یہ توقع رکھتے کہ زمانہ خود ہی اس شخص اور اس کے کلام کو ختم کر دے گا۔ اس کی شہرت چند روزہ ہے۔ اگر جنون کے اثر کے تحت وہ ہمیں کچھ ڈراوے دے رہا ہے تو ان کو سنجیدہ لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ اس کی بہکی بہکی باتیں ہیں جن کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

جہاں تک حضور کے پیش کردہ کلام پر اعتراضات کا تعلق ہے ان پر سیر حاصل بحث اوپر ہو چکی ہے۔ اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ کی حیثیت عرفی کو داغدار کرنے کی کوشش کی گئی تو خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخالفین کے تمام الزامات سے بری کیا۔ فرمایا کہ ہمارے یہ رسول تمہارے لیے کوئی اجنبی نہیں ہیں، یہ تمہارے اندر پیدا ہوئے۔ تمہارے ساتھ رہے ہیں۔ ان کی زندگی کا ہر دور بچپن سے جوانی تک تمہارے اندر گزرا۔ تم میں سے ہر شخص ان کے خلق عظیم کا معترف اور ان کی شرافت، صداقت، امانت، دیانت اور عفت و پاکیزگی کا گواہ ہے۔ چالیس برس کی عمر تک تم نے ان پر ہمیشہ اعتماد کیا لیکن جب سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دل پر اپنی تعلیم نازل فرمائی ہے تم پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ گئے ہو اور ان سے سابق کردار کو بالکل بھلا بیٹھے ہو جب کہ نہ ان کے مشاہدات میں کسی جھوٹ اور فریب نفس کو دخل ہے اور نہ وحی کا القاء کوئی واہمہ ہے۔ یہ جو کچھ پیش کر رہے ہیں اس میں غیب دانی کی کوئی نمائش نہیں اور نہ یہ پیسہ بٹورنے کا ذریعہ ہے۔ کیا تم اس کلام کے اثر کو نہیں دیکھتے کہ اللہ اپنے ان کلمات کے ذریعے سے باطل کو مٹا اور حق کا اثبات کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام شیطان کے کرنے کا نہیں ہے۔ دنیا میں آج تک کسی جھوٹے اور جعل ساز نے اس طرح کا فیض بخش اور روح و قلب کو منور کرنے والا کلام پیش نہیں کیا جس طرح کا کلام یہ قرآن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قریش کے پاس حضور کے کردار پر حرف رکھنے کی کوئی گنجائش نہ تھی اور نہ وہ

دلیلوں سے کسی کو آپ کے خلاف قائل کر سکتے تھے۔ اسی لیے وہ عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے قسمیں کھا کھا کر ان کو مطمئن کرتے۔ بعض بد خصلت سردار حضور کو لوگوں کی نظروں سے گرانے کے لیے اشارہ بازی اور پھبتی سے کام لیتے۔ چنانچہ قرآن نے اشارہ بازوں اور پھبتی کسنے والوں کو نہایت سخت الفاظ میں ملامت کی اور ان کا ٹھکانہ آخرت میں وہ جہنم بتائی جس میں مجرمین کو ستونوں سے باندھ کر آگ میں بند کر دیا جائے گا۔ ایسا ہی ایک سردار اخنس بن شریق ثقفی تھا جو بنو ثقیف میں سے ہونے کے باوجود قریش کے ایک خاندان بنو زہرہ میں سے ہونے کا مدعی تھا۔ یہ قرشی کہلانے کی خاطر قریش سادات کی ہاں میں ہاں ملاتا اور ان کی چاپلوسی کرتا۔ یہ شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار ہوتے ہوئے مسلمانوں کے اندر وسوسے اور غلط فہمیاں پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہتا تا کہ ان میں پھوٹ پڑ جائے اور ان کے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کے خلاف بدگمانیاں پیدا کی جا سکیں۔

کفار کے اس الزام کے جواب میں کہ محمد اپنا کلام خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور اس طرح لوگوں پر دھونس جماتے ہیں، قرآن نے ایک اہم حقیقت یہ واضح فرمائی کہ اللہ کے رسول خدا کی نہایت کڑی نگرانی میں اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ جس طرح فرشتہ وحی سے کوئی جن یا کوئی شیطانی قوت وحی کا خزانہ چھین نہیں سکتی اور وہ بالکل خالص اور بے آمیز شکل میں اللہ کے رسول کے حوالہ ہوتا ہے، اسی طرح رسول کے پاس وہ خالص اور بے آمیز شکل میں اس طرح رکھا جاتا ہے کہ خود رسول کی بھی مجال نہیں ہوتی کہ وہ اپنے جی سے اس میں کوئی ردو بدل کر دے۔ اگر خدانخواستہ کوئی رسول ایسا کرنے کی جسارت کرے تو اللہ کی سنت یہ ہے کہ "ہم اس کو اپنے قوی بازو سے پکڑیں گے اور اس کی شاہ رگ ہی کاٹ ڈالیں گے۔ پھر کوئی بھی اس کو ہم سے بچانے والا نہیں بن سکتا۔"

قرآن نے رسول اللہ ﷺ کی زبان سے یہ اعلان بھی فرمایا کہ تم قریش پر یہ بات واضح کر دو کہ اگر میں گمراہ ہوں اور تم اس بنا پر میرا ساتھ نہیں دے رہے ہو تو میں اپنی گمراہی کا خمیازہ خود بھگتوں گا اور تم اس کے وبال سے محفوظ رہو گے۔ لیکن اگر میں ہدایت پر ہوں اور یہ ہدایت میرے پاس اپنے رب کی طرف سے نازل ہو رہی ہے تو اس صورت میں تم وحی الٰہی کے جھٹلانے والے ٹھہرو گے اور اس جرم کا انجام کوئی سہل چیز نہیں ہوگا۔ اس لیے میرے معاملہ میں اچھی طرح غور کر کے کوئی فیصلہ کرو۔

قرآن نے رسول اللہؐ کو یہ تسلی بھی دی کہ وحی تم نے اپنی خواہش سے نہیں پائی اور نہ اسے اپنی خواہش سے پا سکتے ہو۔ جس ذات نے یہ چشمہ فیض جاری کیا ہے وہی اس کو رواں بھی رکھ سکتا ہے اور اس کو روکنے پر بھی قادر ہے۔ اگر اس نے یہ امانت تمہارے سپرد کی ہے تو وہ اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا

ہونے کی توفیق بھی عطا کرے گا اور دشمنوں کی سازشوں سے بھی محفوظ رکھے گا۔ بس تم صبر و استقامت سے اپنا کام کیے جاؤ اور دشمنوں کی چالوں کو خاطر میں نہ لاؤ۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ کافی ہے۔ بہت جلد یہ اپنا انجام دیکھ لیں گے۔

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے پیش کردہ کلام کو عوام الناس کی نظروں سے گرانے کے لیے قریشی سرداروں نے جتنے جتن بھی کیے وہ سب رائیگاں گئے۔ نہ حضور ہی کی شخصیت کو داغدار کیا جا سکا اور نہ آپ کے کلام ہی سے متعلق بدگمانیاں پھیلا کر اس سے لوگوں کو متنفر کیا جا سکا۔ حضور کے پیروؤں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی اور قریش کے ہر خانوادے میں مسلم و کافر کی تقسیم واضح نظر آنے لگی۔ اس صورت حال میں قریش اکابر کے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا کہ وہ مسلمان ہونے والوں پر مزید ظلم کریں، نبی ﷺ کی ذات کو بھی نشانہ بنائیں، قرآن سننے سنانے کو ایک مشکل کام بنا دیں اور دہشت پھیلا کر نئے دین کی دعوت کی راہ میں روڑے اٹکائیں۔

تدبر حدیث شرح موطا امام مالک

(جلد اول)

کی اشاعت کے بعد اب

تدبر حدیث شرح صحیح بخاری

(جلد اول)

شائع ہو گئی ہے

ابواب: کتاب الوحی تا کتاب الوضو اور کتاب البیوع تا کتاب الحوالہ

شرح: مولانا امین احسن اصلاحیؒ

ترتیب و تدوین: خالد مسعود، سعید احمد، سید اسحاق علی

صفحات: 580 تقطیع 30x20/8 ہدیہ: 360 روپے

ادارہ تدبر قرآن و حدیث لاہور

امین احسن اصلاحی

شکر نعمت

سوال: شکر نعمت سے کیا مراد ہے؟ انفرادی زندگی میں اس کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے؟

جواب: شکر نعمت سے مراد میرے نزدیک یہ ہے کہ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے اس کی قدر کیجئے۔ قدر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو نافع کاموں میں اپنے لیے بھی اور اپنے بھائیوں کے لیے بھی لگائیے۔

انفرادی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو دماغ دیا ہے، عقل دی ہے، شعور دیا ہے، ذرائع اور وسائل دیے ہیں۔ ملک کی حکومت اگر پرامن ہو تو یہ بڑی نعمت ہے۔ پھر آسمان ہے، ابر و ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں دی ہیں۔ ان سب کو استعمال کیجئے لیکن اسی مصرف میں جس مصرف کے لیے اللہ تعالیٰ نے دی ہیں۔ اپنی کسی طاقت اور صلاحیت کو شیطان کے حوالہ نہ کیجئے۔ اپنے دماغ سے وہ سوچئے جو سوچنا چاہیے۔ قلم میں اگر طاقت ہے تو وہ لکھیے جو لکھنا چاہیے۔ اس سے گھاس نہ کاٹیے۔ علیٰ ہذا القیاس وقت خدا کی ایک بڑی نعمت ہے، یہ بہت بڑا سرمایہ بھی ہے۔ وقت کو اگر آپ ضائع کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بہت ہی قیمتی سرمایہ کو آپ مفت میں پھینک رہے ہیں۔ وقت کو کسی لغو کام میں صرف نہ کریں۔

علیٰ ہذا القیاس آپ شیطانی علوم بہت پڑھتے ہیں۔ یہ علوم آپ کو چالاک تو بنا دیتے ہیں لیکن ان سے آپ صحیح انسان نہیں بن سکتے۔ آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ ان علوم کو، جو اللہ نے اتارے ہیں، سیکھیں، پڑھیں اور جانیں۔ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کو جانیں۔ اسی طریقے سے اگر اللہ نے آپ کو مال دیا ہے تو پیسہ پیسہ کا حساب رکھ کر اس جگہ خرچ کیجئے جہاں خرچ کرنا چاہیے اور اس میں کفایت شعاری کیجئے تاکہ آپ دوسرے بندوں کا بھی حق ادا کر سکیں۔ صحت اللہ تعالیٰ نے دی ہے تو اس کو بین الاقوامی کھلاڑی بننے میں مت ضائع کریں۔ کھیلنا کھیلنے کی طرح ہوتا ہے، زندگی کا نصب العین نہیں ہوتا۔

اجتماعی زندگی میں بھی آپ کو جاننا چاہیے کہ معاشرہ سے منقطع ہو کر زندگی بسر کرنا ممکن نہیں ہے۔ معاشرہ کے حقوق آپ پر ہیں۔ مثلاً ماں باپ کے حقوق، پڑوسی کے حقوق، شہری کے حقوق۔ ان تمام حقوق میں، فرائض میں اپنی صلاحیت کو صرف کیجئے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ ایک جماعت ہی بنائیں بلکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی حقیقت میں آپ کی جماعت ہے۔ آپ اپنے اندر جو صلاحیت پاتے ہیں اس کے مطابق اس کی خدمت انجام دیں۔ معمولی درجہ میں ایمان یہ ہے کہ کہیں کوئی برائی دیکھیں تو اس کو شائستگی کے ساتھ

ٹوٹنے کی کوشش کریں۔

شکر نعمت کے لیے ہر وقت اپنے آپ کو بیدار رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں غفلت نہیں ہونی چاہیے۔ لہٰذا اس کے لیے یہ ترکیب اختیار کرنی چاہیے کہ جب سونے لگیں تو اہتمام کے ساتھ تمام ماثور دعائیں پڑھ کر سوئیے اور اللہ سے دعا کیجیے کہ خاتمہ ہو تو ایمان پر ہو اور جب صبح کو اٹھیں تو اللہ پر ایمان کے ساتھ اٹھیے اور نماز و دعا کے بعد جو کام کرنے ہیں پابندی وقت کے ساتھ کیجیے۔ اس میں نفس کو ڈھیل نہ دیجیے۔

خیر یا شر کی صلاحیت

سوال: سورہ انفال کی آیت ولو علم اللہ فیھم خیرا لاسمعھم میں اشکال یہ ہے کہ اگر خدا نے کفار کو کچھ سنایا ہی نہیں تو ان میں خیر و شر کو معلوم کرنا کیسا ہے کیونکہ انسان تو اس وقت مکلف ہوتا ہے جب اس تک پیغام خداوندی پہنچے اور اس کے بعد اس میں خیر یا شر پیدا ہو۔ اگر خیر کے معنی صلاحیت ہے تو صلاحیت دینے والا اللہ ہے۔ جب اس نے ان میں صلاحیت پیدا ہی نہیں کی تو سنانے یا نہ سنانے کا فائدہ کیا۔

جواب: اگر آیت کا مفہوم آپ نے یہ سمجھا ہے تو آپ نے بڑی زیادتی کی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اللہ نے ایک صلاحیت، یعنی فطرت کا نور ہر شخص کو دیا ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے وہ فطرت ابراہیمی پر پیدا ہوتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جو آدمی اپنی فطرت کی صلاحیت کو زندہ رکھتا ہے، نیکی کی رغبت کرتا ہے اور اس کی طرف مائل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں اضافہ فرماتا ہے۔ لیکن جو شخص اس کی ناقدری کرتا ہے تو، جیسا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا، جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے وہ بھی چھن جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت اور حیوانات کی جبلت میں فرق ہے۔ انسان کو چونکہ ارادہ و اختیار کی آزادی حاصل ہے تو وہ چاہے تو اپنی فطرت کے خلاف کام کر سکتا ہے۔ کیوں کرتا ہے؟ اس لیے کہ وہ خواہشات اور رغبات کا مقابلہ نہیں کر پاتا۔ کیوں نہیں مقابلہ کر پاتا؟ اس لیے کہ اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے، صبر کرنا پڑتا ہے، بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے۔ اس کی اللہ تعالیٰ نے آپ کو صلاحیت دی ہے۔ لیکن اگر ایک آدمی قرآن مجید کے الفاظ میں، کتے کی مانند ہے جس کو ڈانٹو جب بھی زبان نکالے رہتا ہے اور روٹی پھینکو جب بھی زبان نکالے رہتا ہے تو ایسے شخص کے متعلق اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اس کو چھوڑ دیتا ہے، ڈھیل دے دیتا ہے۔ یہ بات انصاف کے عین مطابق ہے۔ باقی رہ گیا کہ قرآن مجید نے یہ جو کہا ہے کہ لاسمعھم تو آپ نے اس کا مفہوم بالکل نہیں سمجھا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن سنانے کے لیے ہی تو اتارا ہے اور پیغمبر ﷺ نے گلی گلی میں لوگوں کے پیچھے پڑ پڑ کر سنایا ہے۔ لیکن وہ سنانا کہ جس کا نتیجہ دل میں اتر جانا ہوتا ہے تو اس کے لیے آپ کے دل میں راستہ ہونا چاہیے۔ آپ نے دل بند کر لیا تو کان تک پہنچانے کا کام جہاں تک ہے

وہ اللہ نے کر دیا۔ رہا دل میں اتارنے کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ آپ Pilot flame کو جلتا رکھیے تب وہ اس کی راہ ہموار کر دے گا، ورنہ نہیں۔

اس سنت الٰہی کو سمجھ لیجیے۔ یہ بالکل منطقی چیز ہے۔ اللہ کی طرف سے نور ہر ایک کو ملا ہوا ہے۔ سوسائٹی، ماں باپ اور معاشرہ ماحول بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ انسان خود مختار مخلوق ہے۔ اس کو اختیار بھی ملا ہوا ہے۔ وہ عقل و شعور کے بیدار ہو جانے کے بعد چاہے تو وہ سارا گند البادہ جو سوسائٹی نے اس کو اڑھا دیا ہے اتار پھینک سکتا ہے۔ بدتر سے بدتر سوسائٹی کے اندر بہتر سے بہتر انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ساری چیزوں کا جائزہ لے کر کہ کیا حق ہے اور کیا نہیں ہے وہ حق کو اختیار کر سکتے ہیں۔ فرض کر لیجیے کہ کسی مجبوری کے باعث وہ ایسا نہ کر سکے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مجبور گنے جائیں گے۔ جمود کی بیڑیوں کو توڑنے کے لیے مردانہ فطرت ضروری ہے۔ صحیح بات کو قبول کرنے کے لیے آپ کے اندر قوت ہونی چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے کو خوف سے، طمع سے اور تمام بیڑیوں سے آزاد کریں۔ کیا ان سے آزاد ہونے کی آپ میں صلاحیت نہیں؟ اگر اللہ پر آپ کا ایمان ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ فلاں بات ٹھیک ہے، میں نے پالی تو پروا نہ کیجیے کہ نوکری جاتی ہے، امارت جاتی ہے یا صدارت جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا مفہوم

سوال: قرآن مجید میں کئی جگہ بیان ہوا ہے کہ لوگوں نے اپنی تدبیر کی اور اللہ نے اپنی تدبیر کی۔ تدبیر تو وہ کرتا ہے جس کی عقل ناقص ہوتا کہ وہ اپنی عقل و فہم کے نقائص کا کسی قدر ازالہ کر سکے۔ قادر مطلق کو اس کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ یہ بات تو نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تدبیر کرنے کو اصطلاحی طور پر صالح قوتوں کے تدبیر کرنے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہو۔

جواب: اصل میں قصہ یہ ہے کہ اللہ میاں جو تدبیر فرماتے ہیں وہ اپنے لیے تدبیر نہیں فرماتے بلکہ اپنے بندوں کے لیے تدبیر فرماتے ہیں۔ انھیں تو کوئی خوف ہوتا نہ ڈر اور نہ کوئی ان پر حملہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا تعلق اس کے بندوں سے ہے۔ فرض کر لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی اسکیم یہ ہے کہ میں ایک چھوٹی سی جماعت کو دشمنوں کے ساتھ اس کے مقابلہ میں یوں فتح دوں گا یا یہ ارادہ ہو کہ ایک لشکر گراں قدر کو جس کو اپنی طاقت کا بڑا زعم ہے اس طریقہ سے پامال کروں گا تو اس تدبیر کا تعلق بہر حال اسی کمزور جماعت سے یا اسی بدمست لشکر سے ہوگا۔ تو جب یہ ان سے متعلق ہوگا تو اس کے لیے اختیار کی گئی تدبیر بھی تدبیر ہی ہوگی۔ اس میں بڑی منصوبہ بندی ہوگی کہ یہاں کس کو مقرر کیا جائے، وہاں کس کو تعینات کیا جائے، یہاں سے کن

لوگوں کو اٹھایا جائے اور وہاں لا کر کس طرح دشمن سے بھڑایا جائے۔ تو واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے لحاظ سے تو کسی چیز کا بھی محتاج نہیں ہے لیکن اس کے جن کاموں کا تعلق اس کے بندوں سے ہے تو وہ اسی طریقہ سے ہوتے ہیں جس طریقہ سے کہ بندوں کے کام ہونے چاہئیں۔

صالح قوتوں کے استعمال کی جو بات آپ نے کہی ہے، یہ کچھ بہت غلط نہیں ہے لیکن ہے یہ باطنیہ کے قسم کی بات۔ اس قسم کی جہل کی باتیں وہ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا معاملات میں جو اپروچ ہوتا ہے وہ بہت غلط ہوتا ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملات جب ہمارے ساتھ ہوں گے تو اسی طریقہ سے ہوں گے کہ جس طریقہ سے ہم ان کو قبول کر سکیں، استعمال کر سکیں، برداشت کر سکیں تو لا زمادہ تدبیری کہلائیں گے۔

سوال: سرمایہ اور زمین میں بڑا واضح فرق ہے، سرمایہ پیدا کیا جاتا ہے لیکن زمین ایک قدرتی تخلیق ہے اسے پیدا نہیں کیا جاتا۔ کیا معاشی اصطلاح کے طور پر اس کو سرمایہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب: واقعہ یہی ہے کہ زمین ایک قدرتی تخلیق ہے اور ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ زمین پیدا بھی کی جاتی ہے۔ قدرتی تخلیق میں ایک طرف وہ کلر، بنجر، وادی، جنگل سب کچھ ہے۔ دوسری طرف زمین نافع، نفع بخش اور مفید ہے۔ یہ نہیں ہے کہ چونکہ وہ قدرتی تخلیق ہے تو وہ کچھ نہیں ہے۔ آپ زمین کو چھوڑے رکھیے جب بھی خدا کی مخلوقات میں سے اس کے جانوروں کے لیے یہ بے حد کارآمد ہوتی ہے۔ لیکن آپ کے لیے وہ جب سرمایہ بنتی ہے تو اس کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے اور اس کو از سر نو تخلیق کرنا پڑتا ہے۔ اگر اصول اقتصادیات سے سمجھنا چاہیں تو میں سمجھا سکتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ اقبال کے شعروں سے آپ بخوبی سمجھ جائیں گے۔ اقبال نے کہا ہے تا کہ

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

مطلب یہ ہے کہ تخلیق کا کام اللہ تعالیٰ نے کیا ہے لیکن اس کی نوک پلک سنوارنے کا کچھ کام انسان کے سپرد بھی کیا ہے۔ انسان زمین کو زراعت کے قابل بنانے میں جو محنت صرف کرتا ہے اس سے یہ سرمایہ بن جاتی ہے۔ اور سرمایہ ہی کی حیثیت سے یہ استعمال کی جاتی ہے۔ یہ جو کسانوں کو زمین دی جاتی ہے یہ حقیقت میں بالکل ٹھیک سرمایہ کی حیثیت سے دی جاتی ہے۔ اس سرمایہ کے بغیر کسان کچھ نہیں کر سکتا۔

سوال: فطرت کی صلاحیت کے استعمال سے جو آپ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بھی مدد کرتا ہے تو کیا پڑھنے لکھنے اور کاروبار میں بھی ایسا ہوتا ہے یا یہ صلاحیت مفرد ہے۔

جواب: فطرت کی صلاحیت ہر میدان میں کام دیتی ہے۔ جس طریقہ سے یہ دین میں، علم میں، معرفت میں، خداری میں کام دیتی ہے اسی طریقہ سے دنیا کے کاموں میں بھی ہے۔ آج کل ہو یہ رہا ہے کہ آپ اپنی فطری صلاحیتیں دنیا کے کاموں میں خوب استعمال کر رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کالجوں میں جو تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ آپ کو ہوشیار تو بنا دیتی ہے لیکن نیک نہیں بناتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کالجوں میں فطرت کی اس صلاحیت کو واضح کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ چالاکی سکھانے کا انتظام ہے اور یہ آ جاتی ہے۔ آپ کی فطرت کے اندر سب کچھ ہے، مذہب، سیاست، سائنس، اقلیدس، ریاضی اور فلسفہ سب کچھ ہے۔ توازن کے ساتھ آپ اپنی پوری فطرت کو بیدار کریں تا کہ مومن کی فطرت جیسی ہوتی ہے اس طریقہ سے ابھرے۔ تب بات بنے گی۔

سائنسی تحقیقات سے مرعوبیت:

سوال: خبر آئی ہے کہ صحرائے سینا میں ۳۰ ہزار سال سے زیادہ قدیم انسانی فوصل (Fossil) دریافت ہوئے ہیں۔ جانداروں کے فوصل کی عمروں کا تعین کیمسٹری کی مدد سے سائنسی طریقہ سے کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ایسی معلومات کی تردید علمی اعتبار سے آسان کام نہیں ہے۔ اس کے برعکس کتب مقدسہ سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان سے کرۂ زمین پر انسان کا وجود زیادہ سے زیادہ ۱۵ ہزار سال تک ثابت کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کچھ صاحب علم آدم کو انسان اول نہیں مانتے بلکہ سمجھتے ہیں اس طرح کے انسان آدم سے قبل بھی ہو گزرے ہیں۔ وضاحت فرما کر مشکور فرمائیں۔

جواب: یہ بات یاد رکھیے کہ سائنس دانوں کا اس زمانے میں رعب بہت ہے، اس وجہ سے لوگ ان کی باتوں کو الہام اور وحی سمجھ کر بہت جلدی قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کے کارناموں کے متعلق ٹھیک کہا ہے جس نے بھی کہا ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ خاص طور پر عصری تحقیقات میں ان کا حال یہ ہے کہ ٹڈے کی ٹانگ پر ہاتھی کا خول چڑھا رہے ہیں اور کچھ عرصہ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ تو ٹڈے کی ٹانگ تھی۔ یہ بات ہم آپ نہیں کہتے بلکہ وہ لوگ خود ہی بتاتے ہیں۔ لہٰذا یہ چیز آپ کو مرعوب نہ کرنے پائے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ سائنس جس دعوے کے ساتھ چلی تھی وہ یہ تھا کہ عنقریب ہم یہ ثابت کر دیں گے کہ اس کائنات کا ماسٹر انسان ہے۔ اب یہ عالم ہے کہ سائنس کے جتنے عالی مقام لوگ ہیں وہ اس

کیفیت سے دوچار ہیں کہ ہم جان گئے کہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہنوز روز اول است۔ یہ میرے نہیں، اہل سائنس ہی کے اعترافات ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ سائنس کے میدان میں جو لوگ اترے ہیں تو ان کو مناظرے کرنے دیجئے۔ بہر حال یہ میدان وہ ہے جس میں اترے بغیر چارہ نہیں۔ اترنا پڑے گا۔ اس کے لیے ہم تو بہت مستعدی کے ساتھ دعوت دے رہے ہیں۔ سائنس کے میدان میں یورپ نے جو ترقیاں کیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو انہوں نے ایشیا کو غلام بنانے میں استعمال کیا۔ اب آپ کا بھی یہ فرض ہے کہ آپ اس میدان میں آئیں اور سائنس کا مقابلہ سائنس سے کر کے ان کو شکست دیں۔ اتنی جلدی مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

مطالعہ حدیث کے لیے موزوں کتاب:

سوال: احادیث مبارکہ کے مطالعہ کے لیے کون سی کتاب ہمارے لیے موزوں ہے۔

جواب: اگر آپ صرف اس مقصد کے لیے کوئی کتاب چاہتے ہیں کہ نیکی اور تقویٰ کی باتیں معلوم ہوتی رہیں تو میرا خیال ہے اس کے لیے ریاض الصالحین اچھی کتاب ہے۔ اگر آپ دین کی مفصل باتیں بھی جاننا چاہتے ہیں تو اگر آپ کو ابن قیم کی کتاب زاد المعاد کا ترجمہ مل سکے تو اس میں اور بھی باتیں آپ کو معلوم ہوں گی اور ایک ایسی کتاب سے معلوم ہوں گی کہ جس کے مصنف پر ہمارے علماء کا بھی اعتماد ہے۔ اس کتاب کو آپ پڑھیں گے تو انشاء اللہ آپ کو فائدہ ہی ہوگا۔ باقی جو حدیث کے جامع مجموعے ہیں مثلاً موطا شریف، بخاری شریف وغیرہ تو ان میں ایسے ایسے معرکے ہیں کہ بغیر استاد کے آپ اپنے طور پر پڑھ کر سمجھ نہیں سکتے۔

پکی قبروں کی ممانعت:

سوال: پکی قبروں کی ممانعت ہے۔ روضہ رسول ﷺ بھی تو پختہ ہے۔ کیا یہ اس زمرہ میں نہیں آتا۔

جواب: پکی قبروں کے حق میں آپ نے یہ دلیل دی ہے کہ حضور ﷺ کی قبر بھی پکی ہے تو اگر یہ قبر حضور نے بنوائی ہوتی یا حضرت ابوبکرؓ نے، حضرت عمرؓ نے، حضرت عثمانؓ نے، یا حضرت علیؓ نے بنوائی ہوتی، یا صحابہ میں سے کسی نے یہ کام کیا ہوتا تب بلاشبہ آپ کی دلیل میں وزن ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ معلوم نہیں کن لوگوں نے قبر پختہ کرنے کا کام کیا ہے تو اب صورت یہ ہے کہ قبر پکی بن چکی ہے۔ ہمارے لیے ایک عظیم مسئلہ ہے کہ کیا کریں۔ اب کچھ کرنا گستاخی ہے اور قبر کے پختہ کرنے کے بارے میں حضور ﷺ کے ارشادات بھی واضح ہیں لیکن اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔

(ترتیب: سید اسحاق علی)

نئی اشاعت

تفسیر قرآن کے اصول

تالیف :- امام حمید الدین فراہیؒ — ترجمہ و ترتیب :- خالد مسعود

موضوعات

1- قرآن میں تدبر و تفکر کی اہمیت
2- قرآن مجید کی ترتیب
3- قرآن۔ ایک مربوط و منظم کتاب
4- اصول تفسیر کو مدون کرنے کی ضرورت
5- اصول تفسیر سے متعلق چند تمہیدی مباحث
6- تفسیر قرآن کے اصول
7- اصول تاویل

قیمت -/80 روپے

اصول فہم قرآن

مصنف :- مولانا امین احسن اصلاحی — ترتیب :- عبداللہ غلام احمد

موضوعات

- فہم قرآن کے لیے چند بنیادی اصول
  1- قرآن مجید کی دعوت عقل و فطرت پر مبنی ہے۔
  2- قرآن مجید کی ترتیب اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔
  3- قرآن حق و باطل کے امتیاز کے لیے کسوٹی ہے
  4- قرآن مجید قریش کی ٹکسالی عربی زبان میں نازل ہوا۔
  5- قرآن قطعی الدلالہ ہے۔
- نسخ اور اس کی حکمت
- حکمت قرآن کے فہم کے لیے اساس

قیمت -/34 روپے

اسباق النحو

مصنف :- خالد مسعود

- امام فراہیؒ کی کتاب پر مبنی نئی ترتیب کے ساتھ
- عربی زبان کے قواعد کی تعلیم کا جدید انداز
- اسم، فعل اور حرف کا ضروری تعارف
- ترجمہ کے لیے مشقیں

قیمت -/36 روپے

"میرے نزدیک یہ کتاب طلبہ فن کے لئے کافی ہے۔ اس سے عربی زبان عربی زبان سیکھنے کی راہ باز ہو جائے گی"۔ مولانا امین احسن اصلاحی

ملنے کا پتہ

1- ادارہ تدبر قرآن و حدیث۔ رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی سمن آباد، لاہور۔
2- دار التذکیر۔ رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔